Cartea

گستاخ

1754

گستاخ

جیدیال بویجہ

پبلشر

ماڈرن پبلیکیشنز لمیٹڈ
جالندھر چھاؤنی

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ)

U3
1992
1992
23824
19-12-58
SRINAGAR

پہلی بار ---------- ایک ہزار

قیمت سوا روپیہ۔ سنہ ۱۹۴۹ء



ALLAMA IQBAL LIBRARY



23824

ST 01

باہتمام بابو تلک راج مکوری
(ہوپ پرنٹنگ پریس باغ کرم بخش جالندھر شہر)

فہرس

اُن بہتے ہُوئے ناسُوروں کے نام —

جو اپنا مرہم آپ تلاش کر رہے ہیں

تعارف

جنید یال بوریجہ دس برس سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اُن کے
لکھے ہوئے افسانے "ستارہ" "ویکلی۔ اور "سہارا" میں چھپتے بھی رہے
ہیں۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب اُن کے اسلوب اور کہانی لکھنے کے
ڈھنگ میں اِنفرادیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اِنفرادیت کے ڈھلنے
تک افسانہ نگار ہمیشہ دوسرے لکھنے والوں سے متاثر ہوتا ہے جنید یال
بوریجہ میں بھی جو نیا افسانہ نگار جاگ رہا تھا پہلے پہل مقبول افسانہ نگاروں
سے متاثر رہا۔ وہ بھی نفسیاتی اور جنسی افسانے لکھتے رہے۔ اپنے

افسانوں کے لئے ایسے کردار چلتے رہے جن میں ان گنت الجھنیں ہوا کرتی تھیں

یہ "ادب برائے زندگی" کا دور ہے تخیلی اور رومانی چیزوں کا جادو ٹوٹ چکا ہے۔ ادب اب راجاؤں اور جاگیرداروں کے دل بہلانے کا سامان نہیں رہا۔ ادب میں اب سیاست اور زندگی کے گھناؤنے حقایق کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا۔ ادب ہمیشہ مقصدی رہا ہے پہلے اس کا مقصد محض تفریح تھا۔ لیکن اب اس کا مقصد بدل چکا ہے۔ آج جو ادب عام انسان کی زندگی کو آگے نہیں لے جاتا۔ جو عام انسان کو ہنگامی حالات اور سیاسی ریشہ دوانیوں سے آگاہ نہیں رکھتا۔ اُسے ادب تسلیم نہیں کیا جاتا۔ آج وہی ادیب زندگی کو آگے بڑھا سکتا ہے جو دنیا کے بہتر نظریے کا ساتھ دے رہا ہو۔ جو کھلے سرمایہ دارانہ نظام پر کاری ضرب لگا سکتا ہو۔ جس کی سمت واضح ہو کہ وہ کس کا ساتھی ہے۔ اُس طبقے کا جو صدیوں سے انسانیت کو لوٹ رہا ہے یا پھر اُس طبقے کا جو لٹتا آرہا ہے اور اپنے آپ کو سرمائے کے چنگل سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

جیدیال ہو بحیثیت نبض شناس واقع ہوئے ہیں۔ پھر ان کا تجربہ بھی تو یہی بتا رہا تھا کہ ان کا ذہنی جھکاؤ عوام کی طرف ہے۔ اُن کے حساس دل نے فورا بھانپ لیا کہ انہیں زندگی میں صدیوں سے پلتی ہوئی برائیوں کے خلاف

لڑنا ہے۔ وہ جان گئے کہ دنیا میں ایک صحت مند نظام اور سماج کی ضرورت ہے جس میں مفلسی نہ ہو۔ بیماری نہ ہو جس میں کسی کا حق دبانے والا کوئی نہ ہو۔ جس میں تنومند انسان ہوں جو تساہل پسند نہ ہوں۔ جو کام کریں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے۔

اس جاگتے ہوئے شعور نے جید بابل بو بجہ کو ایک منفرد اسلوب دیا ہے۔ اب ان کا کہانیاں لکھنے کا ڈھنگ اپنا ہے۔ ان کے افسانے ضرورت سے زیادہ مختصر ہوتے ہیں۔ لیکن شدت تاثر سے لبریز۔ اس مجموعے میں نو کہانیاں ہیں اور دو ڈرامے۔ ڈراموں میں تفریحی عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن ان کی دو کہانیاں "اور وہ آگے بڑھتا گیا" —— اور "پسینے کے قطرے" ان کے امید افزا مستقبل کی خبر دیتی ہیں۔ اگر انہوں نے اس رنگ کو اپنائے رکھا۔ تو انسانیت کو ان کی نگارشات سے بہت کچھ توقع ہو سکتی ہے۔

ان کہانیوں میں انہوں نے انسانیت کے دشمنوں کو ننگا کیا ہے۔ ان کی فریب کاریوں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کی گندی ذہنیت کو چاک کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس طبقے کی بیداری دکھائی ہے۔ جو صدیوں سے ان انسان دشمن درندوں کے جبڑوں میں جھنجھوڑا گیا ہے بوبجہ کے ان دو افسانوں میں یہ مظلوم طبقہ اب مظلوم نہیں رہا۔ بلکہ

اس میں جوابی حملے کی قوت پیدا ہو گئی ہے۔

بویجہ کے افسانوں کی زبان بھی نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ تاکہ جن کے لئے انہوں نے کہانیاں لکھی ہیں اُن کی سمجھ میں آسکیں۔ زبان کے سلسلے میں بویجہ کا یہ شعور اُن کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے کیونکہ وُہ جانتے ہیں کہ یہی زبان آگے چل کر عوام کی زبان ہو گی۔

مخمور جالندھری

گستاخ

"شنکر صاحب! آج سے آپ دفتر نہ آیا کریں۔" فیکٹری کے مینیجر نے اپنی داڑھی کو کھجلاتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟ کیا قصور کیا ہے میں نے؟"

"اس لئے کہ آپ فیکٹری کے سب افسروں سے گستاخی سے پیش آتے ہیں۔ بورڈ کو مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا ہے اور گستاخوں کی جگہ ہمارے پاس نہیں۔"

گستاخ! یہ لفظ آج ہی نہیں بلکہ شنکر اپنے بارے میں کئی بار سن چکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک مرحلہ بھی طے نہیں کیا تھا جس میں اسے گستاخ نہ کہا گیا ہو۔ کیا اس کی قسمت میں یہی

لکھا تھا وہ سوچنے لگا۔ وہ گھر آتے ہی بستر پہ گر پڑا۔ گستاخ! گستاخ۔ یہ لفظ اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ کیا وہ واقعی گستاخ تھا۔ اُسے اپنے اسکول کا زمانہ یاد آنے لگا جب کہ ماسٹر نے اُسے پہلے ہی دن جماعت سے گستاخ کہہ کر نکال دیا تھا حالانکہ اس نے ماسٹر سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اُس کے بائیں گال پر تھپڑ نہ مارے۔ کیونکہ اس کا دانت درد کر رہا تھا۔ کیا یہ گستاخی تھی؟ شاید۔ کیونکہ اُس کے باپ نے بھی یہ بات سن کر تڑاخ سے ایک تھپڑ جڑ دیا تھا۔ شنکر کو اپنے سوئے گیاشی باپ کی آواز سنائی دینے لگی۔ جو کہہ رہا تھا "وہ استاد کا یہ حق ہوتا ہے۔ کہ وہ جہاں چاہے اپنے شاگرد کے تھپڑ لگائے"۔

دوسرے دن اسی اسکول میں اُسے اسی ماسٹر کے پاس بھیجا گیا تھا اُسے خوب مار پڑتی تھی اور سب لڑکے اُسے گستاخ گستاخ کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ اُس کا ماسٹر بھی اُسے شنکر نہیں بلکہ گستاخ کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ اور ذرا سی غلطی پہ اسے زور سے تھپڑ لگاتا تھا کہ اس کی سٹی گم ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اسے سب لڑکوں سے باری باری ناک پکڑوا کر تھپڑ لگواتا اور سب سے کہتا کہ اُس سے نہ کھیلا کریں۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اُس سے بات بھی کی جائے۔ اُسے یاد آنے لگا وہ کس طرح اسکول کے ایک کونے میں درخت کے نیچے بیٹھ کر رو دیا کرتا تھا۔ اور لڑکے اسے دور سے دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتے تھے اور اُس کے نزدیک بھی نہ آتے تھے۔ جیسے وہ کوئی اچھوت تھا۔ سب گستاخ

گستاخ کہہ کر تالیاں بجاتے اور گیت بنا بنا کر گاتے۔ ایک دن اس نے اپنے ساتھی موہن کو خوب پیٹا تھا۔ وہ ہر روز اسے گستاخ کہا کرتا اور ہنسا کرتا۔ لیکن اس پر بھی شنکر کو الٹا پیٹا گیا۔ اور اس کے بعد اس سے زیادہ مذاق کیا جانے لگا تھا۔ گھر میں اس کی بڑی بہن بھی ہمیشہ اسے اسی نام سے پکارا کرتی۔ آخر اس نے کیا قصور کیا تھا جس کی اسے اتنی بڑی سزا دی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ شاید وہ واقعی گستاخ ہے؟ اسے یاد تھا کہ شادی کے پہلے ہی روز جب وہ اپنی بیوی کو گھر لایا تھا تو اس کی بہنوں نے اس کے کان بھرنے شروع کر دیئے تھے۔ کہ شنکر گستاخ ہے۔ اس کی بیوی رات کو ہمیشہ سب کچھ اسے بتا دیا کرتی تھی۔ اور جب وہ یہ بات جا کر ماں سے کہتا۔ تو اس کی ماں بھی اسے گستاخ کہہ کر چھیڑتی۔ اسے وہ وقت یاد آنے لگا جب اسے اپنے والدین کی زیادتیوں سے تنگ آ کر گھر چھوڑنا پڑا۔ اب اسے میز پر رکھے ہوئے آئینے میں ماسٹر کی شکل دکھائی دینے لگی۔ جو اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو:۔

"کیا تم گستاخ نہیں ہو؟"

شنکر کے جی میں آئی۔ کہ وہ ماسٹر کی ناک پکڑ کر اسے خوب پیٹے۔ وہ یہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ مگر زہریلے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ انہیں نہ سننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گستاخ تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ آج زندگی میں

پہلی بار اُسے نوکری سے گستاخ ہونے کے الزام میں علیحدہ نہیں کیا گیا تھا۔ آج سے دس سال پہلے اُس نے STE EVANS & CO, کے پاس ساٹھ روپے ماہوار پر نوکری کی تھی۔ اور چھ ہی مہینے بعد اُسے گستاخی کے جرم میں برخاست کر دیا گیا تھا۔ کتنا رنج ہوا تھا اُسے اس وقت۔ اُس نے کیا ہی کیا تھا۔ ایک عورت جو اُس دکان میں کپڑے خریدنے آئی تھی۔ اُس سے اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ کہ وہ سِلک کے تھانوں پر سے اٹھ کر پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ جائے۔ اُس عورت نے اُسے کھینچ کر طمانچہ مارا تھا۔ اور گستاخ گستاخ کہتے ہوئے مالک سے شکایت کی تھی۔ اُس میں اس کا کیا قصور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اُس نے تو عورت سے صرف یہی کہا تھا۔ کہ مہربانی کر کے کرسی پر بیٹھ جائیے اور پھر مالک کے فائدے کے لیے۔ کیا اُس کے تھان خراب ہونے سے اُسے کوئی ذاتی نقصان پہنچتا تھا۔ لیکن قصور وار اُسے ہی ٹھہرایا گیا۔ اُسے گستاخ کہہ کر برخاست کر دیا گیا۔ حالانکہ لوگوں کے سامنے طمانچہ بھی اُس نے کھایا۔ بے عزتی اُسی کی ہوئی تھی اور اس کے باوجود نکالا گیا۔ مالک نے آتے ہی ساٹھ روپے اس کے منہ پر دے مارے اور سب کے سامنے دکان سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ کتنے زور سے وہ چلا رہا تھا۔ اس پاس کے سبھی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور وہ سب کے سب ہنس رہے تھے۔ سوائے اس کے دو چار ساتھیوں کے جو خاموش کھڑے تھے۔ اس کو یاد تھا گھر آتے ہی اس کی بیوی نے بھی اُسے

ہی ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ اور اسے گستاخ کہا تھا۔ اس نے اپنے بوڑھے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا جس نے اس کی بیوی کو خرافات بکنے سے روکا تھا۔ اتنی سی بات پر اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے میکے چلی گئی تھی۔ وہ اپنے بچے بھی ساتھ لیتی گئی۔ شنکر کو ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ گئی۔ اسے وہ وقت یاد آیا۔ جب کہ اس کے سسر نے اس کے گھر کی دہلیز میں کھڑے ہو کر اس پر تھوکا تھا۔ اور گستاخ کہا تھا۔ بستر میں لیٹے لیٹے اسے وہ دہلیز نظر آنے لگی۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اور دہلیز کو ٹھکرانے لگا۔ لیکن دہلیز اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ تھک ہار کر واپس آگیا۔ بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے خون بہ رہا تھا۔ لیکن وہ اس سے بے خبر تھا۔ وہ دہلیز کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ دہلیز کیوں نہ اس کے سسر کو ہڑپ کر گئی۔ جس نے اس کی اتنی بے عزتی کی تھی۔ گلی کوچے والے بھی اب اس کی عزت نہ کرتے تھے۔ جب وہ گھر سے نکل کر دفتر جاتا۔ گلی کی سب شریر لڑکیاں اسے دیکھ کر ہنستیں۔ انہیں سب حال معلوم تھا۔ گلی کے نوجوان لڑکے اسے گذرتا دیکھ کر خبطی کہہ کر پکارتے۔ کیا وہ واقعی گستاخ تھا؟ اسے دوسری نوکری سے بھی اسی لیے نکالا گیا۔ STEEVANS & CO. سے چھٹی پاکر وہ ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہو گیا تھا۔ اور وہاں سے بھی اسے دھکے مار کر نکالا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ کھنچ گیا۔ جب کہ اسے ریلوے سے بھی بے عزتی سے نکال دیا گیا۔ آخر اس نے قصور ہی کیا کیا تھا۔ صرف ایک

آدمی کو فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ سے نیچے اُتار دیا تھا۔ اُس کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ یہ تو اُس نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ اور وہ اُس کے ساتھ ادب سے بھی پیش آیا تھا۔ لیکن اپنا فرض ادا کرنے پر بھی اُسے قصوروار ٹھہرایا گیا۔ اُس کے کانوں میں اُس آدمی کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔

"یہ ٹکٹ چیکر نہایت ہی گستاخ آدمی ہے۔ اس نے مجھے دھکے مار کر ٹرین سے نیچے اُتارا ہے۔ اس نے ایک شریف آدمی کی بے عزّتی کی ہے۔ میں ضرور اس کا بدلہ لوں گا۔ میرے بہت گواہ ہیں۔ یہ گستاخ ہے یہ گستاخ ہے"

اور اُس کے بعد اُس پر مقدمہ چلا۔ اور گستاخ ہونے کا جرم ثابت ہو گیا۔ چونکہ وہ عارضی طور پر رکھا گیا تھا۔ اِس لیے اسے ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دے کر نکال دیا گیا۔ ایک شریف آدمی کو گاڑی میں سے اُتارنے کے جرم میں، جس کے پاس ٹکٹ بھی نہیں تھا۔ اور جو اپنی شرافت کے ثبوت میں پچاس گواہ جمع کر لایا تھا۔ انہوں نے گیتا پر ہاتھ رکھ کر اُس کے شریف ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اس کی شرافت کا صاف ثبوت یہ تھا کہ اس نے تین سو میل بغیر ٹکٹ سفر کیا تھا۔ اگر اُس کی نیت ٹکٹ خریدنے کی ہوتی تو وہ کسی سٹیشن پر اُتر کر خرید سکتا تھا۔

جب وہ ایک مہینے کی تنخواہ جیب میں ڈال کر گھر آرہا تھا۔ تو اُسے وہ روپے بُری طرح چبھ رہے تھے اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُن کو پھینک دے۔ اور کہیں دُور نکل جائے۔

سال بھر اُسے یہ اُمید رہی کہ ایک نہ ایک دن وہ دُنیا پر یہ ثابت کر دکھائے گا۔ کہ وہ گُستاخ نہیں ہے۔ بلکہ ایک شریف اور سچا آدمی ہے لیکن وہ دن نہ آیا اور شاید آئیندہ بھی نہ آئے۔ اُس کے کانوں میں اُس شریف آدمی کی آواز پھر گونجنے لگی "یہ گستاخ ہے یہ گستاخ ہے" اُس نے اپنے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نہ کچھ سُننا چاہتا تھا نہ دیکھنا۔ لیکن اُسے اپنے خیالات سے چھٹکارا نہیں ملتا تھا۔ اُس نے بہتیری کوشش کی۔ کہ وہ کچھ نہ سوچے۔ لیکن بار بار اُسے گستاخ گستاخ کے الفاظ یاد آ جاتے اور وہ کیسے نہ سوچتا۔ آج ہی تو اُسے نوکری سے اسی جرم میں علیحدہ کیا گیا تھا۔ اِس لئے کہ وہ فیکٹری کے افسروں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ وہ اسے گالی نہ دیا کریں۔ لیکن وہ کام کراتے کراتے ہمیشہ اُسے یہی بہی گالیاں دیا کرتے۔ کیا اُن کی اس حرکت کے خلاف آواز بلند کرنا کوئی جرم تھا، ہاں شاید جرم ہی تھا وہ سوچنے لگا۔ نہیں نہیں۔ اُس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ کسی کو کیا حق تھا کہ وہ اُسے گالی دے۔ نہیں نہیں وہ گستاخ نہیں تھا۔ لیکن یکایک اُس کے کانوں میں پھر اُس کے باپ۔ اس کے ماسٹر۔ اُس کی بیوی۔ اُس کے سسر۔ STE EVANS & CO کے مالک۔ ریل گاڑی کے شریف آدمی اور فیکٹری کے مینیجر کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"یہ آدمی گستاخ ہے، یہ آدمی گستاخ ہے!"

ہر طرف سے گستاخ گستاخ کی آوازیں آنے لگیں۔
"وہ گستاخ ہے"۔ اتنے آدمی کیا جھوٹے بول سکتے ہیں۔ اتنے آدمی بھلا غلط ہو سکتے ہیں۔ ایک اُس کے بارے میں غلطی کر سکتا ہے دو کر سکتے ہیں۔ لیکن اتنے آدمی ایک ہی سا الزام نہیں لگا سکتے تھے۔ کہ وہ گستاخ ہے۔ اُسے اپنے کمرے کے چاروں طرف سے گستاخ گستاخ کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس کا سارا کمرہ ان آوازوں سے گونج رہا تھا۔ اُسے اب یقین ہو گیا تھا۔ کہ وہ واقعی گستاخ تھا۔۔۔ وہ جلدی سے بستر پر سے اُٹھ بیٹھا اور اپنا کمبل لپیٹ کر اپنے گھر کے دروازے سے باہر نکلا۔ اُس نے دروازہ بھی بند نہ کیا۔ کیا مجال تھی جو اُس کے گھر کے پاس کوئی پھٹک بھی سکتا۔ اُس نے اپنی لال آنکھوں سے دروازے کو پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور گلی میں نکل گیا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر اُس کے پاس کے گھر کی ایک لڑکی ہنسنے ہی والی تھی کہ شنکر آگے بڑھا۔ اور تڑاخ سے اُس نے لڑکی کے گال پر ایک تھپڑ جڑ دیا اور بولا۔
"گستاخ کہیں کی"۔

اور وہ آگے بڑھتا گیا

رامو رکشا کھینچتا جا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں اوپر سے پڑتی ہوئی برف پر پھسل پھسل جاتے۔ مگر وہ تیزی سے قدم جماتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اُسے اندھیرا ہونے سے پہلے اپنی رکشا میں بیٹھے ہوئے سیٹھ اور اُس کی عیاشی محبوبہ کو پہاڑی کی دوسری طرف لے جانا تھا جہاں سیٹھ کا بنگلہ تھا۔ یہ اُس کے آج کے پہلے گاہک تھے۔ وہ سارا دِن سڑکوں پر گھومتا رہا تھا۔ لیکن کوئی اُسے رکشا میں بیٹھنے والا نہ ملا تھا۔ مسوری میں دسمبر کے مہینے میں لوگ کم ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ تو اکتوبر میں سردیاں کے آتے ہی بھاگ جایا کرتے تھے۔ بچارے رامو کو تب دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کے لئے پیسے کمانے بھی مشکل ہو جاتے۔ آج بھی

وہ مایوس ہو کر گھر جانے ہی والا تھا کہ سیٹھ اور اس کی محبوبہ اسے مل گئے۔ حالانکہ اندھیرا ہونے والا تھا۔ اور برف پڑنی شروع ہو گئی تھی لیکن رامو انکار نہ کر سکا۔ وہ ہاتھ آئی دولت کو کیسے جانے دیتا اور پھر اس نے صبح سے کچھ نہیں کمایا تھا۔ گھر یونہی لوٹ جاتا تو اسے معلوم تھا کہ بیوی سے جھگڑا ہوتا۔ وہ ہمیشہ یہی سمجھتی تھی کہ وہ افیون کھا کر کہیں سو رہتا ہے۔ اور رات خالی ہاتھ گھر لوٹ آتا ہے۔ اسی لئے پہاڑی کی دوسری طرف جانا بھی اس نے قبول کر لیا۔ سیٹھ نے رکشا میں بیٹھتے ہی پانچ روپے کا نوٹ رامو کے ہاتھ میں دے دیا۔ رامو پہلے تو حیران ہوا۔ کہ آج بھگوان اتنا مہربان کیوں ہے۔ پھر اس نے ارادہ کر ہی لیا اس نے آسمان کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ اور مسکرا کر چل پڑا۔

حالانکہ وہ جانتا تھا کہ راستہ بہت دشوار اور تنگ تھا۔ وہ چھاتی کا زور لگا کر دونوں ہاتھوں سے رکشا تھامے ہوئے تھا۔ اور اونچی سڑک پہ تیزی سے ہانپتا ہوا جا رہا تھا۔ برف پڑ رہی تھی۔ اور وہ پسینے میں شرابور تھا۔ کبھی کبھی جب پسینہ اس کی گردن تک بہنے لگتا۔ تو وہ سوچتا۔ اگر بھگوان نے اسے رکشا والا نہ بنایا ہوتا تو اتنی سردی میں کیسے جیتا۔ ورنہ اس کے ننگے جسم پہ ایک پرانا اوور کوٹ اتنی بلا کی سردی کو کب تک روک سکتا تھا۔ ــــــ وہ ہانپتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر اس کی بیوی کا مزاج درست ہوا۔ تو کم سے کم آج کے دن تو گھر میں حلوہ ضرور پک سکے گا۔ اور

اُسے انفیونی بھی نہیں کہا جائے گا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا۔ اور آگے بڑھ رہا تھا......

برف اور تیزی سے پڑنے لگی تھی۔ اور اس کے سر پر کنکریوں کی طرح برس رہی تھی۔ لیکن اس کی رفتار میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اپنی رکشا میں جھانکا۔ سیٹھ اپنی کالی محبوبہ کی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے اونگھ رہا تھا۔ ایسے جیسے وہ رکشا میں اتنی دیر بیٹھے بیٹھے تھک کر چور ہو گیا ہو۔

برف کپاس کی طرح آسمان سے لگاتار گر رہی تھی۔ اور رامو قدم جماتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

سارا راستہ سفید برف سے اٹا پڑا تھا۔ اور رامو کے پاؤں میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔

"کتنا سندر نظارا ہے!" سیٹھ کی محبوبہ نے اسے جگاتے ہوئے کہا۔ سیٹھ نے ایک منٹ کے لئے آنکھ کھولی اور بولا ــــــ

"کافی اچھا ہے!" اتنا کہہ کر وہ پھر اونگھنے لگا۔

رامو نے بھی آسمان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس نے رفتار اور بھی بڑھا دی۔ وہ بڑھتی ہوئی تاریکی کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ برف اور تیزی سے پڑنے لگی۔

رامو نے سوچا۔ شاید اس کے لئے اب رکشا کھینچنا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے رکشا کی رفتار دھیمی کی اور بولا ــــــ

"سیٹھ جی! اگر اجازت ہو تو دو منٹ کے لیے درخت کے نیچے ٹھہر جاؤں۔ برف بڑی تیزی سے پڑ رہی ہے۔"

"آگے بڑھو۔"

سیٹھ نے اپنی محبوبہ کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔ "ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔"

"لیکن سیٹھ جی!"

"بڑھتے چلو۔ اندھیرا کافی ہو گیا ہے۔ آہستہ کیوں ہو گئے۔"

رامو نے پھر رفتار بڑھا دی۔ اسے تاریکی میں سیٹھ کی لال لال آنکھیں گھورتی ہوئی دکھائی دیں۔ روپوں نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ ورنہ وہ اسے ابھی رکشا سے اتار دیتا۔

چڑھائی زیادہ سیدھی ہو گئی۔ برف باری کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔ اور رامو پھسلتا پھسلتا ہانپتا ہانپتا آگے بڑھتا رہا۔ برف اس کے پرانے اوورکوٹ کے سوراخوں میں سے گذر کر اس کے جسم تک پہنچ گئی تھی۔ اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نوکدار خنجر اس کے اوورکوٹ میں پھینک دیا گیا ہو۔ اس کے دانت بجنے لگے۔

سردی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اور ابھی ایک میل اور جانا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سیٹھ اور اس کی کالی محبوبہ جسے وہ کہیں ہوٹل سے پکڑ لایا تھا۔ اپنی ٹانگوں پر کمبل ڈالے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس کی محبوبہ آہستہ آہستہ کوئی انگریزی گیت گنگنا رہی تھی۔ جبکہ اس نے

کئی بار اپنی رکشا میں بیٹھی ہوئی اس جیسی نیم فرنگی عورتوں سے سنا تھا جنہیں امیر لوگ ہوٹلوں اور ریستورانوں سے پکڑ لاتے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انہیں کیا وہی ایک گیت آتا تھا۔ جو وہ اپنے ہر چاہنے والے کو سنایا کرتی تھیں۔ اس سے تو اس کی رکشا اچھی تھی۔ کیسی دلکش اور مدھر آوازیں نکلتی تھیں اس کی رکشا کے پہیوں سے۔ اسے ان لڑکیوں کے گیتوں میں ذرا بھی مزا نہیں آتا تھا۔

"ڈارلنگ"۔ سیٹھ نے اپنی محبوبہ کی بغل میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی برانڈی ہو"

اور سیٹھ نے اپنے اوور کوٹ کی دائیں جیب میں سے ایک چھوٹی بوتل نکالی۔ اور اپنی محبوبہ کے منہ میں چند قطرے ٹپکا دیئے۔ "اچھی ہے نا" سیٹھ نے اس کی طرف مسکرا کر کہا۔ اور چند گھونٹ غٹاغٹ پی گیا۔

راموں کو جب برانڈی کی خوشبو آئی۔ تو اس کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اور پھر اس نے سوچا۔ اگر دو گھونٹ مل جائیں۔ تو سفر جلد کٹ جائے گا۔

"سیٹھ جی ایک گھونٹ برانڈی کا مجھے بھی۔" راموں نے سردی سے کانپتے ہوئے التجا کی۔

"کیا کہا برانڈی! کل تو میرے ہاں دعوت اڑانے بھی آجائے گا بڑھتے جاؤ"

راموں اس روکھے سے جواب سے ذرا بھی نہ گھبرایا۔ ایسی باتیں

تو اُسے روزانہ سہنی پڑتی تھیں۔ جب کبھی کوئی ایسی بات ہو اکرتی تھی

تو وہ مسکرا دیا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی مسکراہٹ میں درد اور بے کسی کی

داستاں چھپی ہوتی تھی۔

راہوں رات کی تاریکی اور برف سے ڈھکی ہوئی پگڈنڈی پر اپنے ننگے پاؤں مضبوطی سے رکھتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اب اُسے تھکاوٹ تک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اُس کی ٹانگیں مشین کی طرح خود بخود چل رہی تھیں اُس کے ہاتھ غیر ارادی طور پر رکشا کو تھامے ہوئے تھے۔ اور اس کی آنکھیں سامنے کی پگڈنڈی پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی اسے آدھ میل اور اوپر چڑھنا تھا وہاں پہاڑی کی چوٹی پر۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ انہیں اُسے پہنچانا ہی تھا۔ اُس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اُسے آگے ہی آگے لئے جا رہا تھا۔

وہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے اب رات کی تاریکی اور آسمان سے گرتی ہوئی برف کی بالکل پروا نہیں تھی۔ اور نہ ہی اب اُسے سیٹھ سے برا نڈی مانگنے یا درخت کے نیچے انتظار کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اور رکشا میں بیٹھے ہوئے سیٹھ اور اس کی کالی محبوبہ کو دیکھا اور اپنی گرفت پکی کر کے آگے بڑھتا گیا۔

برانڈی کے چند گھونٹوں نے سیٹھ پر مستی طاری کر دی تھی وہ اپنی محبوبہ کی مرضی کے خلاف اُس کے ساتھ چمٹا جا رہا تھا اور وہ اسے پرے دھکیل رہی تھی۔

رکشا زور زور سے ہچکولے کھانے لگی۔ رامو کے پاؤں زمین پر سے پھسلنے لگے۔ اُسے اپنی گرفت ڈھیلی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رکشا کے بازوؤں پر وہ اپنی گرفت اور پکی کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اُسے اب دوگنا زور لگانا پڑ رہا تھا۔ اب اُسے ان ہچکولوں کو روکنا تھا اور رکشا کو بھی چڑھائی پر لے جانا تھا۔ اُس کے سوکھے پھوڑوں میں بُری طرح سے درد ہونے لگا۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں تن گئیں اور اُن میں نیلی نیلی رگیں اُبھر آئیں۔ اُس کی گردن میں بے شمار رگیں نظر آنے لگیں۔ جیسے اُس کی گردن صرف رگوں ہی سے بنی ہوئی ہو۔ اس کا پرانا اوور کوٹ ایک کندھے پر سے اُتر گیا۔ اور اس کے سفید اور میلے کندھے پر برف خنجروں کی طرح وار کرنے لگی۔

لیکن اُس سے ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے صبر کی طاقت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ رکشا میں متواتر دھینگا مشتی ہو رہی تھی۔ اور رکشا بُری طرح سے ہچکولے کھا رہی تھی۔ کبھی کبھی رکشا سے رامو کو خفیف سی ہنسی کی آواز سنائی دے جاتی۔ شاید سیٹھ کی محبوبہ جنگ ہار چکی تھی۔ اور سیٹھ کی فتح کے گُن گا رہی تھی۔ رامو کو ہر بات میں سیٹھ کی فتح نظر آتی ..... لیکن وہ آگے بڑھتا گیا۔

سیٹھ کا بنگلہ صرف دس گز دور رہ گیا۔ لیکن چڑھائی بہت سخت تھی۔ رامو نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور پھسلتی برف پر پاؤں جماتے ہوئے تیزی سے پورا زور لگاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا......

چڑھائی بہت سخت تھی۔ یکایک اسے اپنے پاؤں پھسلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسے اپنی گرفت ڈھیلی پڑتی دکھائی دی۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ بازو جواب دے گئے۔ اور راکشا کڑھکتی ہوئی دور کھائی میں جا پڑی۔

بکری اور عورت

رات کی تاریکی میں اکثر اپنی بالکنی پر کھڑا ہو کر وہ ٹھنڈی ہوا کھایا کرتا۔ یوں تو وہ ہمیشہ شام کو اپنی بیوی کے ساتھ سمندر کے کنارے جایا کرتا تھا۔ لیکن جو مزا اسے بالکنی میں قمیض اتار کر ٹھنڈی ہوا میں کھڑے ہونے کا آتا۔ وہ اسے کہیں نہ آتا۔

وہ اکثر اپنی بالکنی میں ہوا کی مخالف سمت میں قمیض اتار کر کھڑا ہو جاتا۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا کے جھونکے اس کی چھاتی سے مس کرتے ہوئے گذر جاتے۔ ٹھنڈی اور خوشگوار ہوائیں اس وقت اس کی چھاتی کے بال ایک عجیب انداز سے کھڑے ہو جاتے۔ اسے اپنے جسم میں ایک عجیب قسم کی جھرجھری سی محسوس ہوتی۔ وہ اکثر سر نیچا کر کے

اپنے بالوں کو دیکھا کرتا۔ جو ہوا کے تیز جھونکوں سے کبھی دب جاتے اور کبھی اُٹھ کھڑے ہوتے۔ کبھی کبھی وہ اپنی چھاتی زور سے ملنے لگتا۔ اور وہاں بیٹھا بیٹھا دہ دہونے لگتا۔ آج بھی حسب معمول وہ اپنی بالکنی پہ کھڑا تھا اس کی نظریں سڑک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ آنے جانے والوں کا جائیزہ لے رہی تھیں۔ وہ آنے جانے والوں کے چہروں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

اتنی رات گئے تو صرف وہی نکلتے تھے جنہیں کچھ کام ہوتا تھا۔ یا پھر وہ جوان جوڑے جو ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چلتے۔ وہ جب کبھی ایسے جوڑے کو دیکھتا۔ تو اس کے دل میں ایک رنج بھری لہر سی اُٹھتی۔ کہ اس کی بغل میں کب کوئی لڑکی ہوگی۔ اُسے شادی کی سوجھتی۔ لیکن جب وہ اپنی موجودہ آزادی اور اس غلامی کا مقابلہ کرتا۔ تو وہ کنوارا ہی رہنا پسند کرتا۔ حالانکہ اس وقت وہ سخت بے چینی سے دوچار ہوتا۔ اور پھر وہ اپنی نظریں کسی اور طرف گاڑ دیتا۔

آج بھی وہ اپنے خیالات میں محو کھڑا تھا۔ کہ اسے اپنی بالکنی کے نیچے ایک چیخ سنائی دی۔ جب اس نے نیچے جھک کر دیکھا۔ تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اِدھر اُدھر جھانکنے سے بھی پتہ نہ چلا۔ کہ اتنی بلند چیخ کہاں سے اُٹھ سکتی تھی۔ رات کے سناٹے میں آج اسے پہلی بار کچھ ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ جونہی وہ سونے کے لیئے کمرے کی طرف مڑنے لگا ایک اور ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ اور وہ وہیں رک گیا۔

اِدھر اُدھر جھانکنے سے اُسے ایک بار پھر کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندھیر نے جھٹ سے سامنے رکھی ہوئی قمیض پہنی اور سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا اس کی بالکنی کے عین نیچے اُس کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک عورت لیٹی ہوئی تھی۔ اور دوسری اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ پہلے تو اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ یہ عورتیں مکان کے اندر داخل کیونکر ہوئیں شاید وہ دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ اور پھر وہ عورت لیٹی ہوئی کیوں تھی وہ مضبوطی سے قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھا۔ بیٹھی ہوئی عورت اُسے دیکھ کر کانپ گئی۔

"بس دو منٹ کی دیر ہے" عورت نے کانپتے ہوئے کہا۔

اندھیر نے بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی نگاہیں اس لیٹی ہوئی عورت پر پڑیں۔ جو خاموشی سے ٹانگیں پھیلائے ہوئے تھی۔ اُس کا پیٹ قدرے پھولا ہوا تھا۔ اور اُس کی چنریا اس کے اوپر پڑی ہوئی تھی۔ وہ زور زور سے سانس لے رہی تھی۔

اندھیر ایک دم سے سمجھ گیا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گئیں۔ اُسے ہسپتال کیوں نہ پہنچایا گیا۔ وہ سوچنے لگا شاید وہ اپنے ہونے والے بچے کے باپ کا نام نہ بتانا چاہتی ہو۔

عورت نے آہستہ آہستہ کراہنا شروع کیا۔ اور خوفناک قسم کی آوازیں نکالنے لگی۔ اس نے آہستہ آہستہ رونا شروع کر دیا۔

"مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ نہیں ہوتا ماں" اور پھر خاموش ہو گئی۔

بڑھیا کچھ نہ بولی۔ اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور خاموش بیٹھی رہی۔ رندھیر سے یہ سب کچھ نہ سہا گیا۔ آج اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنی خوفناک اور بھیانک چیخیں سنی تھیں۔ اور عورت جس کی وہ بہت قدر کیا کرتا تھا۔ اسے بیچارگی کی حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا

"چلو اسے ہسپتال لے چلیں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"نہیں اب تو وقت قریب آ گیا ہے۔" بڑھیا نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رندھیر خاموش رہا۔ عورت پھر کراہنے لگی۔ اس نے آہستہ سے کہا

"بس اب ...."

بڑھیا نے جھٹ سے اپنا دوپٹہ اتارا۔ اور اس کا پلو عورت کے منہ میں دے دیا۔ اور اس کی ٹانگیں دیوار کے ساتھ لگا دیں لیٹی ہوئی عورت نے دوپٹے کو اپنے دانتوں میں بھینچ لیا۔ اور زور لگانے لگی۔ بڑھیا نے دوپٹہ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "شاباش بیٹا۔ تھوڑا سا اور زور لگاؤ۔ ہاں بیٹا.... بس اب دو منٹ کی دیر ہے۔"

عورت زور لگاتی۔ اور پھر رک کے کراہنے لگتی۔ رندھیر سوچ رہا تھا۔ کہ اس عورت کو بچہ جننے میں اتنی تکلیف کیوں ہو رہی تھی پچھلے سال اس کے نوکر کی بکری نے بھی تو اسی ڈیوڑھی میں بچہ دیا تھا اسے تو بس دس پندرہ منٹ تکلیف ہوئی تھی۔ اور پھر ننھا سا خوبصورت میمنا

پیدا ہوا تھا۔ ہاں مگر اُس کے نوکر نے بہت سا گھی کھلایا تھا اُسے۔ کہتا تھا اُسے تکلیف نہ ہو گی بچہ جنتے وقت شاید اس عورت نے بہت سا گھی نہیں کھایا تھا۔

بکھری اور عورت۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ اِتنے میں عورت کی ایک چیخ نے اُسے چونکا دیا۔ اُس کے اُوپر کا دوپٹہ اس کی ایک ٹانگ سے سرک گیا تھا۔ اور اُس کی سفید پھولی ہوئی ٹانگ اور اُس میں سبز سبز سوکھی رگیں نظر آ رہی تھیں۔ اُس کے پاؤں بھی سوجے ہوئے تھے۔ اور اُن پر میلے دھاگے بندھے ہوئے تھے — عورت کا کراہنا قدرے کم ہوا۔ اور اُس کی ٹانگوں کے نیچے کچھ سرسراہٹ دکھائی دی ہاں زندگی جنم لے چکی تھی۔

رندھیر نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ وہ اس عورت کی بے چارگی پر غور کر رہا تھا۔ اس وقت اُسے بالکل پروا نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا اور بچہ پیدا ہو رہا تھا۔ اُسے اس کی بے بسی پر رحم آیا۔ بچے کے رونے نے اُسے مُڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ بڑھیا گوشت کے ایک غلیظ لوتھڑے کو اپنے دوپٹے سے صاف کر رہی تھی وہ بڑھتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ انہیں ہسپتال لے جاتیں تو اتنی تکلیف نہ ہوتی"۔

"لے تو گئی تھی صاحب۔ لیکن وہ کہنے لگے ہسپتال میں جگہ نہیں۔ اور اپنے گھر تو ہم ڈاکٹر بلا ہی نہیں سکتے تھے۔ اتنی فیس کہاں

سے لاتے۔ وہاں ایک دایہ کے پاس لے جا رہی تھی۔ کہ راستے میں تکلیف
ہو گئی اور ذرا کمزور بھی ہے اسی لئے درد زیادہ ہوا۔"

رندھیر نے لیٹی ہوئی عورت کی طرف نظر ڈالی۔ اس کے اوپر کا دوپٹہ
ایک طرف کو کھسک چکا تھا۔ اور اسے نیند آگئی تھی۔ اس کا پیٹ اب بیٹھ
گیا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اسی طرح بھینچی ہوئی تھیں
اس نے عورت کے پیلے چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے سوچا۔ غالباً اس
نے کافی گھی نہیں کھایا۔

رندھیر پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب اُن
کے نوکر کی بکری بچہ دینے والی تھی۔ صبح ہی سے تیاریاں ہونے لگی
تھیں۔ اس کی والدہ بھی تو بڑی دلچسپی لے رہی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے
بیاہی ہوئی بکری کا ذکر چھڑ جاتا۔ اور جب وہ گھڑی آنے والی تھی تو
اس کی والدہ نے نوکر کو بے پروائی سے ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا اور اس
پر بہت بگڑی تھی "کچھ سمجھ رکھا بھی ہے۔ جا۔ اندر سے صاف سا تولیہ اور
دوا و بدھوا
صابن اٹھا لا۔ کیا بیلا (یہ بکری کا نام تھا) ایت ہی میں ختم ہوئے گی"
اور پھر اس کی والدہ بدھوا کی بیوی پر بھی برسی تھی۔ "فرش کو
ذرا لیپ پوت دیا ہوتا۔ کیا تجھے پتہ نہیں تھا۔ کہ یہ گھڑی کبھی بھی
آ سکتی ہے۔ کچھ اپنا خیال کر۔ کل یہی وقت تجھ پر بھی آ سکتا ہے۔"
پڑوس ہی میں سلوتری ڈاکٹر رہتے تھے۔ احتیاط کے طور پر انہیں

بھی بلوا لیا گیا تھا۔ اور جب مینا آیا تو اُسے نہلایا گیا۔ اور اُس پہ کچھ اتنا نکھار آیا۔ کہ اُس پہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

رندھیر نے اچانک اُس عورت کے بچے کی طرف دیکھا جو جالے اور خون سے بھرا ہوا تھا۔ بڑھیا کے پاس کوئی سفید کپڑا بھی تو نہیں تھا وہ اپنے میلے دوپٹے ہی سے اُسے پونچھ رہی تھی۔ رندھیر کو گھن آنے لگی۔

اتنے میں اس بڑھیا نے بیٹی کی گردن میں ہاتھ دے کر اُسے اُٹھایا۔ اور دونوں اُٹھ کر چل دیں۔ جب کہ دور نکل گئیں تو رندھیر اپنی سوچ سے بیدار ہوا۔ اُس کے جی میں آیا۔ کہ وہ ان دونوں کو بلا لے ـــ وہ حیران تھا۔ کہ عورت بچہ جنتے ہی اُٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل کیوں کر ہوگئی۔ عورت لڑکھڑا رہی تھی۔ بڑھیا بڑی مشکل سے اُسے گرنے سے بچا رہی تھی۔ رندھیر کے بازو پھڑپھڑائے۔ وہ بڑھنے ہی والا تھا کہ نہ جانے کیا سوچ کر رک گیا۔

طوفان کے بعد

پیارے ہی کی ماں روزانہ اُس بند کمرے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی۔ وہ اُس بند دروازے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی۔ جو اُس کے پاکستان چلے جانے والے مُسلمان کے ساز و سامان کے درمیان لال قلعہ کی طرح حایل تھا۔ اُس نے کئی دفعہ سوراخوں سے جھانک جھانک کر دیکھا تھا۔ بڑے بڑے ٹرنک ویسے کے ویسے ہی رکھے ہوئے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ اپنے ٹرنک پاکستان چھوڑ کر آئی تھی۔

وُہ ہر روز سوتے وقت پیارے ہی کے پتا سے کہتی۔ "کیوں نہ یہ سامان ہم اپنے قبضے میں کر لیں"۔

لیکن وہ انگڑائی لیتا اور ایک جمائی لے کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پیاری کی ماں جلتی بھنتی ساری رات بستر میں کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دیتی۔ اُسے پیاری کے پتا پر بہت غصہ آتا۔ پہلے بھی تو اسی کی بدولت اتنا نقصان ہوا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا:۔

"لاہور میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور لاہور میں ہی مریں گے چاہے انگریزوں کی حکومت ہو یا مسلمانوں کی۔ غنڈوں اور لفنگوں کو پولیس کا ڈر ہونا چاہیئے بھلا شرفا کو ان سے کیا ڈر۔"

اور وہ پندرہ اگست کے بعد بھی نومبر تک لاہور میں رہے لیکن بند کے بنائے ہوئے شرنارتھی کیمپ میں۔ اور انہیں اپنے مکان میں سے نکلتے وقت اپنے چھوٹے لڑکے کی بھینٹ دینی پڑی تھی۔ کاش وہ پہلے نکل آتے حالانکہ پیاری کا ماموں دو مہینے پہلے اپنا ٹرک لایا تھا۔ لیکن پیاری کے پتا نے کہا تھا۔

"ہم تو لاہور میں پیدا ہوئے ہیں اور لاہور میں ہی مریں گے۔"

پیاری کی ماں اطمینان سے سوتے ہوئے پیاری کے باپ کو دیکھتی۔ اور دو موٹے موٹے آنسو اُس کی آنکھوں میں چھلکنے لگتے۔ وہ سوچتی۔ یہ مرد بھی دل کے کس قدر مضبوط ہوتے ہیں۔ کیسے آرام سے سوتا ہے پیاری کا پتا۔ وہ تو جب سے پاکستان سے آئی تھی رات کو کم ہی سوتی تھی۔ اُن کا بیٹا جب غنڈوں کی غلیل ریزی کی نذر ہوا تھا۔ اس وقت بھی پیاری کے پتا کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے لیکن اس کی

اپنی آنکھوں سے خون ٹپکتا رہا تھا۔ وہ سوچتی۔ کیا سبھی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اسے تو ایک مرد سے واسطہ پڑا تھا۔ اور وہ تھا اس کا پتی۔ جسے وہ ابھی تک نہ سمجھ سکی تھی۔ اسے اتنا غصہ آتا اور چاہتی کہ سوتے میں پتی کے گنجے سر سے ایک وہ بال اور کھینچ لے۔ اور اسے میٹھی نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دے۔ لیکن وہ ایسا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی اگر وہ اس کا پتی تھا۔ اس کا پرماتما۔

وہ کتنی بار رات کو کسی نہ کسی بہانے اپنے پتی کو ضرور جگا دیتی۔ کبھی چوہے کے بہانے اور کبھی سردرد کے بہانے جب سے وہ ہندوستان میں آئے تھے۔ پیاری کے پتا نے رات کی بات چیت بھی بند کر دی تھی۔ وہ تو کھانا کھاتے ہی کمبل تان کر سو جاتا۔ اور پھر صبح ہونے پر اٹھتا۔ رات کو وہ اگر کبھی جگاتی بھی تھی تو وہ ہوں ہاں کر کے پھر سو جاتا۔ لیکن پیاری کی ماں کی آنکھیں ہمیشہ اس کمرے کی طرف لگی رہتیں جس کا ایک دروازہ ان کے سونے کے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اور سب سامان اپنے ہاں اٹھا لائے۔ وہ اس سامان کو اپنی ملکیت سمجھتی۔ حالانکہ اس کا پتی اس سے کہتا رہا تھا۔

"اب یہ سامان مسلمانوں کا سامان نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اپنی سرکار کا ہے۔ دیکھتی نہیں ہو۔ اس پر کسٹوڈین کی مہر لگی ہوئی ہے!"

لیکن وہ چلا اٹھتی:-

"یہ سامان تو ہمیں مکان کے ساتھ ملنا چاہیئے۔ اس سے دوگنا سامان تو ہم چھوڑ آئے ہیں۔ ہم ضرور لیں گے یہ سامان۔"

اور وہ کمرے کا دروازہ توڑنے پہ اصرار کرتی۔ اسے قانون کی پرواہ نہیں تھی۔ قانون۔ وہ اس لفظ کو حقارت سے گنگناتی۔ قانون کونسے قانون کے تحت انہیں لاہور سے نکالا گیا تھا۔ کس قانون سے اس کے چاند جیسے پیارے بیٹے کو غنڈوں کی تلوار کی بھینٹ کیا گیا تھا کیسا اور کونسا قانون تھا یہ؟ سرکار کیا؟ اسے تو بھگوان کے قانونوں پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔

جب سے وہ ہندوستان آئی تھی۔ اس نے گیتا پڑھنا بھی بند کر دی تھی۔ وہ باتیں اب اسے فضول اور واہیات نظر آتیں۔ قانون قانون کی اب ہستی ہی کیا رہی تھی۔ لیکن پیارے کا پتا اسے کبھی اتنی جرات نہ کرنے دیتا۔ کئی دفعہ جب وہ ہتھوڑا لے کر تالا توڑنا چاہتی۔ تو وہ اسے روک دیتا۔ اور پیارے کی ماں کا غصہ آنکھوں سے آنسو بن کر بہ نکلتا۔

اب آنسو ہی اس کا سرمایہ حیات تھے۔ آخری سرمایہ۔ تالا توڑنے کی دھن ہر وقت اس پر سوار رہتی۔ رات کو وہ خواب بھی سامنے کے کمرے کے دیکھا کرتی۔ اس نے کئی دفعہ خواب میں دیکھا تھا۔ کہ وہ رات کو چپکے سے اٹھی ہے۔ اور اس نے تالے کو ایک جھٹکے سے توڑ کر پھینک دیا ہے اور کمرے کے اندر گھس گئی۔ اور سب ٹرنک ایک ایک کر کھول ڈالے

اُن کے اندر چمکتے ہوئے زری اور ریشم کے کپڑے تھے۔ ویسے ہی جیسے کہ اُس نے اپنی پیاری کے جہیز کے لئے بنائے تھے۔ بالکل ویسے ہی۔ لیکن جب اس کی آنکھ کھلتی۔ تو سب اُمیدیں خاک میں مل جاتیں۔ لیکن اُسے اُمید تھی کہ ایک نہ ایک دن اُس کی خواہش ضرور پوری ہوگی وہ ہمیشہ پیاری سے کہا کرتی۔

"تیرے جہیز کے کپڑے عنقریب ہمیں واپس ملنے والے ہیں۔ اور اسی کمرے میں بند پڑے ہیں۔ صرف دروازہ کھولنے کی دیر ہے۔"

پیاری شرم کے مارے جواب تو نہ دیتی۔ لیکن اس کا دل خوشی سے ناچ اُٹھتا۔ نرم اور ریشمی کپڑے پہننے کی خواہش اُس کے دل میں شدت کے ساتھ جاگ اُٹھتی۔ لاہور میں جب اُس کی ماں سو جاتی تو وہ چپکے سے اُٹھ کر ریشمی کپڑوں کو جو کہ اس کے جہیز کے لئے اُس کی ماں نے بنائے تھے اپنی چھاتی سے لگاتی۔ اور ان پر ہاتھ پھیرتی۔ اپنے چہرے سے لگاتی اور آنکھیں بند کر کے انہیں چومتی۔ اُسے اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا۔ جب وہ یہ کپڑے پہن کر اپنے پتی کے سامنے جائے گی لیکن پاکستان بنتے ہی اُس کی سب حسرتیں خاک میں مل گئی تھیں۔ وہ خواہش اب اُس کے سینے میں دب کر رہ گئی تھی۔ اُس کا منگیتر اُس کے بھائی سے جا ملا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اب اس کی شادی کبھی نہ ہوگی۔ لیکن جہیز کے کپڑوں کا ذکر سن کر اُسے کچھ اُمید بندھ گئی۔ وہی لال رنگ کے ریشمی کپڑے اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے جیسے دنوں

کی یاد اُسے تڑپا دیتی۔ اُس کی آنکھیں بھی اپنی ماں کی طرح آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ اور وُہ اپنے باپ کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی جو اُنہیں تالا توڑنے نہیں دیتا تھا۔ وُہ اُسے اپنی خوشی کے درمیان حائل سمجھتی لیکن وُہ اپنی دُھن کا پکّا تھا۔ اُس نے انہیں تالا نہ توڑنے دیا۔ وُہ قانون کا پابند تھا۔ لاہور میں بے قانونی کے ایّام میں بھی اُس نے کبھی اپنی زندگی اور شرافت کے قانون کو نہیں توڑا تھا۔ وُہ جانتا تھا کہ تالا توڑنا جُرم ہے۔ کیوں کہ اُس پر سرکار کی مُہر لگی ہُوئی تھی جسے اُس کی بیوی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھی۔ وُہ ہر وقت چِلّاتی رہتی ــــ "تالا توڑ دو۔ تالا توڑ دو!"

اور پیاری کی خاموش نگاہیں اُس تالے پر لگی تھیں، اور وُہ اپنے جہیز کے سامان کو دیکھنے کے لئے ہر وقت بے قرار رہتی۔ وُہ اُس دن کے خواب دیکھتی۔ جب وُہ پہلے کی طرح لال ریشمی کپڑوں کو سینے سے لگائیگی۔ آنکھوں سے ملے گی۔

آخر وُہ دِن آن پہنچا۔ جب پیاری کی ماں کو اپنی اُمیدیں پُوری ہوتی ہُوئی نظر آئیں۔ اُس دِن تالا توڑا جانے والا تھا۔ اور کسٹوڈین نے بتایا۔ کہ وُہ اندر کا جو سامان لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔

پیاری کی ماں خُوشی سے جھُوم اُٹھی۔ اُسے یہ جان کر بہت خُوشی ہُوئی۔ کہ سامان کو خریدنے کا پہلا حق اُنہی کا ہے۔ پیاری نے کمرے کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔ اُسے اپنے جسم میں ایک عجیب قسم

کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے ریشمی کپڑوں کا انتظار کرنے لگی اُسے بیتے دن یاد آنے لگے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو جوش اضطراب سے ملنے لگی۔ وہ اپنے پتا کی حماقت پر مسکرانے لگے۔ جو پاس ہی کمرے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ پیاری اور اس کی ماں دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔

کسٹوڈین کے حکم سے تالے کو تھوڑا سا توڑ دیا گیا۔ وہی تالا جسے پیاری اور اس کی ماں ہر روز غصّے سے دیکھا کرتی تھیں۔ مدت سے بند دروازے کو کھولا گیا۔ اندر سے گندی اور سڑی ہوا کی بدبو آ رہی تھی۔ لیکن وہ سامنے سے نہ ہٹیں ———— اندر بڑے بڑے کالے ٹرنک پڑے تھے۔

کسٹوڈین نے باری باری سب ٹرنک کھول دیئے۔ جن پہ چھوٹے چھوٹے تالے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن وہ سب کے سب خالی تھے۔ پیاری اور اُس کی ماں کی مایوس نگاہیں خالی ٹرنکوں میں جہیز کے کپڑے ڈھونڈ رہی تھیں۔

کانفرنس

"ابھی اور کتنی دیر ہے؟" شامو کی بیوی نے میلے بنچ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"درد زیادہ بڑھ رہا ہے۔ برداشت نہیں ہوتا۔"

شامو نے سامنے لٹکے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا اور خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے اپنے بچے کی یاد ستانے لگی جسے وہ اپنی پڑوسن کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اس نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ سے دودھ نہیں پیا تھا۔ شاید وہ اپنی ماں کے لئے تڑپ رہا تھا۔ دودھ۔ اس سے قیمتی تحفہ ایک ماں اپنے بیٹے کو نہیں دے سکتی۔ ڈیڑھ مہینے سے شامو کی بیوی کا دودھ خاک کی نذر ہو رہا تھا۔ ماں کی ممتا اسے بند بھی تو نہ ہونے دیتی تھی۔ دودھ کی

دھاریں پھوٹ پھوٹ کر اُس کی چھاتی سے نکلتی رہتیں۔ لیکن وہ اس کے بیٹے کے پینے کے قابل نہ تھا۔ وہ زہر اور غلیظ خون سے بھرا ہوا دودھ تھا۔ انجان بچّے کی ایک ہلکی سی ٹھوکر نے اُسے اُس کی غذا سے محروم کر دیا تھا۔ جسے اُس کی ماں مہینوں چھاتیوں میں لئے اُسے پلانے کے لئے منتظر رہی تھی۔ جیون پنساری کی تمام کوششیں بیکار گئیں۔ دُنیا بھر کی کڑوی دوائیں اس زہر کو نہ مار سکیں۔ شاموں تقریباً ہر روز اپنی کمائی پنساری کی نذر کر دیتا۔ اور رات بھر بیٹے کو گود میں لئے ہوئے بیوی کی تیمارداری کرتا۔ جو جسم میں زہر لئے ہر لمحے پانی کے گھونٹ کو ترستی رہتی۔ زہر اس کے سارے جسم میں پھیل چکا تھا۔ چھاتیوں سے لے کر گردن تک۔ اُسے اب سانس لینے میں بڑی تکلیف ہوتی۔ لیکن اُسے سانس لینا پڑتا۔ اس لئے وہ ابھی تک مری نہ تھی۔ اور وہ مرنا بھی تو نہ چاہتی تھی ——— چار ماہ کے بلکتے ہوئے بچے کو چھوڑ کر وہ کیسے جا سکتی تھی۔ ابھی تو اُسے اس بچّے کو جی بھر کر دودھ پلانا تھا۔ اُسے پڑھا لکھا کر کسی دفتر میں بابو بنانا تھا۔ شاموں کی بیوی کی ہزاروں تمنائیں اُس کے ساتھ وابستہ تھیں۔ وہ اس بچّے کو چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتی تھی۔ جس کے پیدا کرنے میں اُسے اپنے جسم کے بند بند میں اتنا درد ہوا تھا۔ کہ اُس کے سامنے موت کا نقشہ کھنچ گیا تھا۔ لیکن اب یہ درد اُس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ درد تو معمولی تھا۔ مگر ایک اور بھی درد تھا جو جان لیوا ثابت ہو

رہا تھا۔ اور وہ ڈر رہی تھا کہ وہ اپنے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتی تھی۔ وہ دودھ جسے اُس نے اپنی چھاتیوں میں سنبھال رکھا تھا۔ بچہ ماں کا دودھ نہ پیئے تو وہ ماں کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔

شاموں کی بیوی درد سے کراہ رہی تھی۔ اس بار شاموں نے پھر کلاک کی طرف دیکھا۔ اور بولا "ابھی تھوڑی دیر اور باقی ہے۔ ہماری باری ساڑھے بارہ بجے آئے گی۔"

"چاہے اس سے پہلے میری جان نکل جائے۔ دیکھو زہر میرے منہ تک چڑھ آیا ہے۔ اب آنکھیں بھی سوج گئی ہیں۔ ہاتھ اب پہلے سے دوگنے ہو گئے ہیں۔" شاموں کی بیوی نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ ابھی تھوڑی ہی دیر اور ہے۔ ہمت نہ ہارو۔"

یہ سن کر شاموں کی بیوی نے ایک سرد آہ بھری اور خاموش لیٹی رہی اب اسے وہ سارا ہسپتال چکر کھاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک پنگھوڑے میں بیٹھی ہوئی ہے اور وہ زور زور سے ہچکولے کھا رہا ہے۔ اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا جب کہ وہ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر میلے جایا کرتی تھی۔ جہاں وہ رنگا رنگ کی مٹھائیاں کھاتی اور اونچے جھولوں میں جھولتی۔ اسے ویسے ہی چکر آتے جیسے کہ وہ آج محسوس کر رہی تھی۔ یکایک جھولوں نے تیزی کے ساتھ گھومنا شروع کیا۔ شاموں کی بیوی کے دماغ سے اس کے باپ کی صورت بالکل غائب ہو گئی وہ سنبھل نہ سکی۔ اور دھڑام سے نیچے آ رہی۔ شاموں نے لپک کر اسے گود

میں اٹھا لیا۔ اور اپنی پگڑی کے پلو سے پنکھا کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ وہ کیا کرے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے مریض نے اس کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔

"ڈاکٹر کو بلا دو۔ ڈاکٹر کو ......" بوڑھے نے کھانستے ہوئے کہا۔

شامو جیسے اسی بات کا منتظر تھا۔ وہ اٹھا اور لپک کر ڈسپنسری میں گھس گیا۔ لیکن ہیٹر دوں میں ملبوس بوڑھے کمپونڈر نے اس کی باتوں کی پروا نہ کی۔

"ابھی تمہاری باری نہیں آئی"۔

مگر میری بیوی کی حالت زیادہ خراب ہے" شامو نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہو جائے گی۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ جاؤ اب دوسرے مریضوں کا وقت ضائع نہ کرو۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس اتنا وقت نہیں" کمپونڈر نے دھمکی دی۔

"اس کی حالت ہی دیکھ لیجیے" شامو نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہم ابھی آتے ہیں"۔

یہ کہہ کر کمپونڈر پھر دواؤں میں پانی ملانے لگا۔ شامو دوڑتا ہوا بیوی کے پاس واپس آ گیا۔ اسے اب قدرے ہوش آ چکا تھا۔ شامو کی غیر موجودگی میں بڈھا مریض اسے پنکھا کر رہا تھا۔

شامو نے بڈھے کی طرف شکر گذارانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور بیوی

کے سر کو گود میں لے کر اُسے دبانے لگا۔

بیس منٹ اور گذر گئے۔ لیکن کمپونڈر نہ آیا۔ لیکن اب ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے اُس کی باری آ گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر خوشی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اُس نے اپنی بیوی کے سر کو گود سے اتار کر صاف اور چمکیلے فرش پر رکھا۔ اور پرچی اُٹھا کر ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چل دیا لیکن جونہی اُس نے چق اُٹھائی۔ ڈاکٹر کی خالی کرسی اُسے نظر آئی۔ صرف وہ بوڑھا کمپونڈر وہاں کھڑا آپریشن کی میز صاف کر رہا تھا۔

"ڈاکٹر ایک کانفرنس میں شریک ہونے گئے ہیں مجھ سے کہہ گئے تھے تمہارا کیس واپس آکر دیکھیں گے۔ کوئی آدھ ایک گھنٹے میں آجائیں گے"۔ کمپونڈر نے بے پروائی سے کہا۔

"مگر میری بیوی تو دم توڑ رہی ہے"۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب کا کانفرنس میں شریک ہونا بھی تو بہت ضروری تھا۔ اگر وہ نہ جاتے تو کانفرنس کیسے ہوتی۔ وہ تو اس کانفرنس کے پردھان ہیں۔ اور پھر یہ کانفرنس بیماروں کی بھلائی کے لیے ہی تو ہو رہی ہے"۔ بوڑھے کمپونڈر نے جز بز ہو کر کہا۔

اور میز پر کے شیشے کو رگڑنے لگا۔ شامو ں ایک دفعہ پھر اپنی بیوی کے پاس ناکام لوٹ آیا۔ اب وہ ایسی حالت میں نہیں تھی۔ کہ اُسے کسی دوسرے ہسپتال میں لے جایا جاتا۔ وہ اپنی بیوی کے سر کو گود میں رکھ کر دبانے لگا اُس کی نگاہیں ڈاکٹر کے کمرے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جو اس وقت اس

کانفرنس کا یہ دھاں تھا۔ جس میں اُس سکیم پر غور کیا جا رہا تھا۔ کہ ہندوستان میں ڈاکٹر اور مریضوں کے لئے دوائیں آسانی سے کس طرح مہیا کی جا سکتی ہیں تاکہ اُن اموات کو روکا جائے۔ جو دیکھ بھال اور دوا کے بغیر واقع ہوتی ہیں۔

شامو دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا۔ کہ کانفرنس جلد ختم ہو جائے۔ اور ڈاکٹر اُس کی بیوی کو دیکھنے کے لئے لوٹ آئے۔ اُس کے ہاتھ بیوی کا سر دباتے ہوئے دُکھنے لگے تھے۔ لیکن وُہ بیوی کے سر کو دبائے چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی پر ایک نگاہ ڈالی۔ خون سے بھرا ہوا دُودھ اس کی چھاتیوں سے بہ کر اُس کی قمیض کو تر کر رہا تھا۔ اس قمیض کو جسے وہ پہن کر پہلے دن اس کے گھر میں آئی تھی۔ اُس سے نہ دیکھا گیا۔ اُس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور بیوی کا سر دبانے لگا۔

"رہنے دیجیے۔ آپ تھک گئے ہوں گے"۔ اس کی بیوی نے آہستہ آہستہ اٹکتے ہوئے کہا۔

شامو نے اپنی بیوی کے پھولے ہوئے گالوں پر سے دو موٹے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر ابھی آتا ہو گا"۔

اُس نے یہ تو کہہ دیا۔ کہ ڈاکٹر جلد لوٹ آئے گا۔ لیکن اب اس کی اپنی ہمت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ ویسے وُہ صبر اور انتظار کا عادی تھا۔ لیکن آج حالت مختلف تھی۔ آج اس کا صبر غصے کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ وُہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر کو

معلوم تھا کہ اس کی بیوی اتنی نازک حالت میں ہے۔ پھر بھی وہ اُسے دیکھے بغیر کانفرنس میں چلا گیا۔

ڈاکٹر موت کو روکنے کے لئے کانفرنس بلا رہا تھا۔ اور ایک زندگی اُس کے دروازے پر پڑی ہوئی دوا کے لئے سسک رہی تھی۔ اور دم توڑ رہی تھی۔ کیا ڈاکٹر کو اُس کے بلکتے ہوئے ننھے بیٹے پر کوئی ترس نہیں آیا تھا۔ شاموں سوچتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر سکتا تھا شاموں نے اپنی بیوی اور اپنے آپ پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ اپنے آپ کو بڑا حقیر سمجھنے لگا۔ اُس کی نگاہیں اپنی جیب کی طرف پڑیں۔ جیب میں اب تک ایک چونی باقی تھی۔ چونی کو ٹٹولتے ہوئے وہ مسکرایا۔ کمپونڈر کو چونی دیتے ہوئے اُسے شرم آگئی تھی۔ اس لئے یہ حقیر رقم کمپونڈر کی نذر نہ گذار سکا۔ اب اُسے اپنی اُس حماقت پر غصہ آ رہا تھا۔ شاید کمپونڈر چونی لے کر خوش ہو گیا ہوتا۔ اور اس نے ڈاکٹر کو چند لمحوں کے لئے روک لیا ہوتا۔

شاموں نے اپنی بیوی کی طرف پھر دیکھا۔ زہر اب اس کے سارے جسم میں پھیل چکا تھا۔ وہ اب نیلی سیاہی میں نہائی ہوئی ایک عورت لگ رہی تھی۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔

دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک نے دو بجائے۔ شاموں کے صبر کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ ایک دم اُٹھ کر ڈاکٹر کے کمرے

کی طرف چل پڑا۔ اس کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ غصے سے انگارہ ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کا گلا آسانی سے گھونٹ سکتا تھا۔ اس کا دل کلاک کی ٹک ٹک کی طرح دھڑک رہا تھا۔ ڈاکٹر کرسی پہ اونگھ رہا تھا۔

ہیں یہ کیا — ! ڈاکٹر تو کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے گیا ہوا تھا۔ یہ سب کمپونڈر کی شرارت تھی۔

شامو ں کو دیکھ کر بوڑھا کمپونڈر سر سے پاؤں تک کانپ گیا "وہ چلو میرے ساتھ چلو میری بیوی مر رہی ہے" شامو ں گرجا۔ اس نے کمپونڈر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اتنا جھنجھوڑا۔ کہ کمپونڈر کی نگاہوں میں اس کی موت پھر گئی۔

اتنے میں شامو ں کی بیوی کی بلند چیخ سُنائی دی۔ شاید وہ مرچکی تھی۔ اور یہ اس کی آخری پکار تھی۔ کمپونڈر کی گردن پہ شامو ں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور وہ بوڑھے کمپونڈر کو چھوڑ کر اپنی بیوی کی طرف لپکا جس کا جسم اکڑ چکا تھا۔

گھسیارن

بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ لیکن گھسیارن برابر گھاس کاٹے جا رہی تھی۔ اُسے تو وہ سارا گھاس کا ٹکڑا کاٹنا ہی تھا۔ جو رنگون سیمنٹ کی کوٹھی کی سیڑھیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس شدت کی گرمی میں وہ اپنے آپ سے اور اپنے گرد و نواح سے بے فکر گھاس کاٹے جا رہی تھی۔

اُسے دو بجے سے پہلے گھاس کاٹ کر منڈی میں لیجانا تھا۔ ورنہ گاہکوں کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اُسے فکر تھی۔ کہ آج اگر گھاس نہ بکا تو رات کو کھانا نہیں پکے گا۔ اور پھر اُسے اپنے معصوم بچے کا بھی تو خیال تھا۔ جو پاس ہی پیلی گھاس میں بیٹھا اپنی

ماں کو تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ جس کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے۔

رامو سیٹھ جب غسل خانے سے نہا کر ٹھنڈی ہوا کھانے برآمدے میں آ بیٹھا۔ تو اُس کی نظریں گھسیارن پر پڑیں۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیلنے لگی۔ اور اُس نے جنیو کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اپنے کالے ننگے پیٹ پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ وہ وہیں گھسیارن کے سامنے برآمدے میں کرسی ڈال جم کر بیٹھ گیا۔

رامو سیٹھ کی عمر بمشکل تیس سال کی ہو گی۔ لیکن آسائش اور دولت کی بھرمار نے اُسے بہت بھدا اور موٹا بنا دیا تھا۔ گرمیوں میں وہ صرف ایک ململ کی دھوتی پہن کر گھومتا رہتا۔ بیاہ تو اُس کا ہو گیا تھا۔ مگر نہ جانے اُس کی بیوی کیوں ہمیشہ میکے ہی رہا کرتی تھی۔ رامو سیٹھ کو اِس بات کی بالکل فکر نہیں تھی۔ وہ روپیوں کی جھنکار سے اپنا دل بہلا لیا کرتا تھا۔

آج اس نئی گھسیارن کو دیکھ کر اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد خوبصورت گھسیارنیں نظر آنے لگی تھیں۔ اور ایسی خوبصورت گھسیارن اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گھسیارن کے چہرے پر کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ پہلے کسی اچھے گھرانے میں سے تھی۔

سیٹھ کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑپھڑانے لگیں۔ وہ گھسیارن کو گھورنے لگا۔ لیکن وہ بے فکر اپنا کام کیے جا رہی تھی۔ کام کرتے ہوئے اسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا۔ کہ اس کے گرد و وسیع دنیا پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے تو صرف ایک ہی مسئلہ تھا۔ کہ وہ جلد سے جلد سارے گھاس کو کاٹ لے۔ تاکہ اسے وقت پہ اجرت مل سکے۔ اسے اپنے دوپٹے کی بھی فکر نہیں رہی تھی جو ڈھلک کر ایک طرف گر پڑا تھا۔

اس کی مردانہ قسم کی قمیض کے بٹن جھٹکوں سے ٹوٹ گئے تھے۔ بچے نے ماں کی چھاتیوں کی طرف دیکھا تو اس کی بھوک چمک اٹھی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ اور سیٹھ رامون کا اشتیاق بھی بڑھ گیا۔ لیکن وہ دونوں سے بے خبر اپنے کام میں مگن تھی۔

گھاس کی سرسراہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی سیٹھ تڑپ اٹھا۔ جب اس نے یہ دیکھا۔ کہ گھسیارن اس کی طرف تو دیکھتی ہی نہیں! اس نے سمجھا۔ شاید گھسیارن کی یہ کوئی چال ہے۔ کہ زیادہ پیسے ہاتھ لگ سکیں۔ سیٹھ دل ہی دل میں مسکرایا۔ اور اپنے پیلے دانتوں پر زبان پھیرتے ہوئے سوچنے لگا۔ "بھگوان کی قسم آج تو پانچ روپے دے ڈالوں گا!"

یوں تو دو ایک روپے میں سیٹھ کا کام چل جاتا تھا۔ اس نے گھسیارن کی توجہ اپنی طرف دلانے کے لیے کھانسنا شروع کیا۔ لیکن وہ

تو دیکھتی ہی نہ تھی۔ سیٹھ اپنی میلی دھوتی سے ناک پونچھتے ہوئے ایک بار اور کھانسا۔ گھسیارن نے صرف ایک بار نظر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔ گھسیارن کے بالوں کی لٹیں اب اس کے چہرے پر بکھر گئی تھیں۔ اسے دن کے اجیالے میں اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ سیٹھ کو یہ منظر نہایت ہی خوش نما معلوم ہوا۔ وہ سوچنے لگا۔ نرم نرم گھاس اور ایک خوبصورت گھسیارن اس کی پریشان زلفیں۔

وہ بچہ تو اسے کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ جو اب سیٹھ کے بڑے پیٹ کو دیکھ دیکھ کر غوں غوں کر رہا تھا۔ اس نے اسے بھی گھاس کا بنڈل سمجھ لیا تھا جسے اس کی ماں روزانہ اُٹھا کر شہر بیچنے لے جایا کرتی تھی۔ وہ اب دونوں ہاتھوں سے زور زور سے تالیاں بجا رہا تھا۔ شاید وہ انتظار اور بھوک کا عادی ہو چکا تھا۔

لیکن سیٹھ انتظار کرنے اور بھوکے رہنے کے حق میں نہیں تھا۔ چیزوں کے حصول کے لئے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ اس انتظار کی تاب لاتا تو کیسے؟

دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ واقعی وہ بڑا خوش قسمت ہے وہ سوچتا۔ اور سب سے زیادہ شکر گذار تو وہ اپنے پتا کا تھا۔ جو کئی سونے کی اینٹیں چھوڑ گئے تھے۔

سیٹھ نے جب دیکھا کہ وہ اس کی طرف دیکھتی ہی نہیں تو

وُہ بہت سٹ پٹایا۔ اُس نے زور سے ایک سیٹی بجانا چاہی۔ لیکن وہ ہوا میں ہی رہ گئی۔ اور وُہ بُری طرح سے ہانپنے لگا۔ گھسیارن کے بچّے نے جب اُسے ہانپتے ہوئے دیکھا تو سمجھا۔ کہ گھاس کی گٹھڑی بھر بھرا رہی ہے۔ جیسا کہ وُہ اپنی ماں کی پیٹھ پر لدے ہوئے گھاس پر بیٹھے ہوئے محسوس کرتا تھا۔ اُس کا دِل چاہتا تھا۔ کہ وہ اس گٹھڑی پر بیٹھ جائے اور زور زور سے اس پر کودنے لگے۔ اور وہ گھاس پر بیٹھا ہوا زور زور سے ہنسنے لگا۔ جیسے وُہ واقعی اُس گٹھڑی پر بیٹھا ہوا ہو۔ اور ہچکولے کھا رہا ہو۔

سیٹھ نے جب بچّے کو ہنستے ہوئے دیکھا تو کچھ گھبرا سا گیا۔ وُہ اپنی میلی دھوتی سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اُس نے ہنستے ہوئے بچّے کی طرف لال لال آنکھوں سے دیکھا۔ وُہ کب پروا کرتا تھا۔ وہ تو اپنی دُنیا کا بادشاہ تھا۔ اُس کی دُنیا میں سیٹھ جیسے اِنسانوں کا وجود ہی نہ تھا۔

گھسیارن برابر گھاس کاٹے جا رہی تھی۔ اور اب سیٹھ اور بچّہ دونوں اس کی طرف بھوکی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اب دونوں کو اپنی اپنی بھوک ستانے لگی۔ دونوں کے صبر کا پیالہ بھرنے والا تھا۔ بچّہ تو پھر بھی خاموش تھا۔ مگر سیٹھ کو شاید اِنتظار کی عادت نہیں تھی۔ وُہ تلملا رہا تھا۔ اور اپنی کرسی میں کبھی بائیں اور کبھی دائیں جانب ہِل جُل رہا تھا۔ اُس کا اضطراب حد سے زیادہ

بڑھ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُٹھ کر گھسیارن کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر اندر لے آئے۔ لیکن یہ شاید اُس کی جسمانی قوت سے بعید تھا۔ اُس نے ہمت کر کے ایک بار پھر اُس گورے کی نقل اُتارتے ہوئے جو کہ اُس کی دکان پہ آیا کرتا تھا۔ ایک ہلکی سی سیٹی بجائی۔ اِس دفعہ وہ کامیاب رہا۔ سیٹی بج بھی گئی۔ لیکن گھسیارن نے سر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ سیٹھ نے دل میں یہ ٹھان لی کہ جیسے بھی ہو اس سے بات کی جائے۔ اس نے ایک بار اور زور سے کھانسا اور بڑی ہمت سے پکارتے ہوئے کہا۔

"گھسیارن!"

"کیا ہے سیٹھ" گھسیارن نے بغیر سر اُٹھائے ہوئے جواب دیا۔ سیٹھ اس بے رخی سے گھبرا سا گیا۔ پہلے تو کسی گھسیارن کو جب وہ پکارا کرتا تھا۔ تو وہ دوڑی ہوئی اُس کے پاس چلی آتی تھی اُس نے سمجھا۔ شاید اس کی آواز کرخت تھی۔ شاید اِسی لیے گھسیارن نے تلخی سے جواب دیا ہے۔ اس نے اپنی بھدّی آواز کو اور نرم کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا۔ یہ ہماری سیڑھیوں کے پاس جو گھاس ہے نا۔ اسے بھی کاٹ دینا۔ کم بخت مچھر کاٹتے ہیں ہمیں رات کو پانچ روپے انعام دوں گا۔ ہاں۔ پانچ روپے"

گھسیارن نے مسکرا کر سیٹھ کی طرف دیکھا۔ وہ اس فیاض دلی

کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ سیٹھ سمجھا شاید کام بن گیا۔ گھسیارن دِل ہی دِل میں سوچ رہی تھی۔ کہ سیٹھ کے پاس اِتنے پیسے کہاں سے آ گئے تھے! خود کیا کماتا ہو گا؟ کُرسی سے ہِل تو سکتا نہیں! اُس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ دولت بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اُسے تو دو روپے کمانے کے لئے بھی چار گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔

سیٹھ ایک دفعہ پھر دعوتی انداز میں کھانسا۔ اور گھسیارن ایک بار پھر مُسکرا دی۔ آج سے پہلے کئی بار کئی آدمیوں نے جن کی کوٹھیوں کے سامنے سے وہ گھاس کاٹنے جایا کرتی تھی ایسا ہی کہا تھا۔ ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ اُس کے دِل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ اُس نے اپنے آپ کو بکیوں کی جھنکار میں بہتا ہُوا پایا۔ وہ سوچنے لگی۔ اگر سیٹھ سے پانچ روپے مِل جائیں۔ تو تین دِن گھاس نہیں کاٹنا پڑے گا۔ تین دِن آرام سے گزریں گے۔ پانچ روپے۔ تین دِن کی روزی! اس کے دِل میں ایک ایسا جذبہ پیدا ہُوا جس نے روپوں کو قبول کرنے کی ترغیب دی۔ وہ سوچ رہی تھی اور برابر گھاس کاٹے جا رہی تھی۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی۔ کہ وہ کیا کرے۔ اُس نے ادھر اُدھر اپنے بچے کی طرف نگاہ ڈالی۔ جو بھوک سے تلملانے کے بعد وہیں پہلی گھاس پر سو گیا تھا۔ اُس سے یہ نہ دیکھا گیا۔ لیکن پھر بھی وہ

اپنے کام میں تیزی کے ساتھ لگی رہی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

وہ تیزی کے ساتھ گھاس کاٹے جا رہی تھی۔ یکایک اُسے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں کچھ درد سا محسوس ہوا۔ اُس نے جب ہاتھ اُٹھا کر دیکھا تو اُس کے انگوٹھے سے خون بہ رہا تھا۔ جوان اور اُبلتا ہوا خون۔ شاید گھاس کاٹتے کاٹتے درانتی لگ گئی تھی۔ لیکن نہ جانے کب؟

سیٹھ اُس کے ہاتھ سے خون بہتا ہوا دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ خون گھسیارن کی آنکھوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہو۔ وہ کچھ لرز سا گیا۔ وہ اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ گھسیارن نے بہتے ہوئے خون اور چھلے ہوئے انگوٹھے کی پروا نہ کی۔ اور برابر پہلے کی طرح گھاس کاٹتی رہی۔ اُسے اِس درد میں بھی ایک لذت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اسی طرح سے اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتی تھی۔ اور ہاں دوسرا راستہ ہی کونسا تھا؟

سیٹھ نے جب دیکھا کہ گھسیارن پھر اپنے کام میں منہمک ہو گئی ہے۔ تو وہ بڑی بیقراری سے کرسی میں جلتی (ریت) کی طرح جھلپل کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر آج گھسیارن نے اس کی بات نہ مانی۔ تو وہ لونڈوں کے تمام بنڈلوں میں آگ لگا

دے گا۔ اس نے آخری کوشش کی۔ اور اس نے پھر ایک ہلکی سی سیٹی بجائی۔ اُدھر گھسیارن کے تیز چلتے ہوئے ہاتھ سُست پڑ گئے تھے۔ اُس کی ذہنی کشمکش انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ سارا دن گھاس چھیلنا۔ اور پھر گھر جا کر چولہا جھونکنا۔ یہ کیسی زندگی تھی۔ اُسے ایک لمحے کے لیے آرام میسّر نہیں تھا۔ وہ بہت تھک چکی تھی۔ وہ آرام چاہتی تھی۔ بس ایک دن کے لئے۔ مسلسل محنت نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔

وہ سیٹھ کے بارے میں اس وقت کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں پانچ کا نوٹ گھوم رہا تھا۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا۔ تھکن کا اُتار۔ آرام کا پیغام۔ دو دن کی راحت۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اُٹھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سیٹھ کے قریب چلی گئی۔ لیکن سیٹھ اُسے آتا ہوا دیکھ کر پہلے ہی کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اُس کے پیلے پیلے دانت پورے طور پر کھلے ہوئے تھے۔ پان کھانے کی وجہ سے اُس کا جبڑا سیاہ ہو رہا تھا۔ اور جب وہ سانس لیتا۔ تو اُس کی بھبک دور تک جاتی۔ اُس کے پھولے ہوئے پیٹ میں سانس نہیں سما رہا تھا۔ سانس لیتے ہوئے اُس کے پیٹ کا اُتار چڑھاؤ نہایت گھناؤنا ہو جاتا تھا۔ بے ڈھنگے پن سے اُس کی پھٹی ہوئی دھوتی اُس کے بھدے پن میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔ اُس کے جسم

کا پل پل کم ہوتا ہوا گوشت جس انداز سے لہرا رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی گھسیارن ایک لمحے کے لئے رُکی ۔ اب پانچ کے نوٹ کی رنگت مدھم پڑ چکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیا وہ اس گندگی سے لپٹ کر دو دِنوں کے لئے آرام کرتے ہوئے اس کی کراہت سے عہدہ برا ہو سکے گی؟

فوراً اس کے دِل نے اس سوال کا جواب دیا۔ "نہیں"

اور یہ "نہیں" اُس کے ذہن میں کوند کر رہ گئی۔

وہ دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن اس نے بڑی تیزی کے ساتھ رُخ پلٹا۔ دوڑتی ہوئی گھاس کے میدان میں آ گئی۔ اُس نے اپنے بچے کو اٹھایا۔ گھاس کی گٹھڑی اپنے سر پر رکھی اور بازار کی طرف چل دی۔ سیٹھ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اُس نے اپنی تجوری کی طرف دیکھا جیسے اُس میں پڑے ہوئے نوٹوں کے تمام بنڈل جل اُٹھے ہوں ؛

میرا پڑوسی

"تھوڑی اور پیو میرے دوست" میرے پڑوسی نے میرے سامنے رکھے ہوئے گلاس میں وسکی انڈیلتے ہوئے کہا
"اپنے اور دنیا کے غم شراب ہی سے غلط کیئے جاتے ہیں"۔
آج صبح سے وہ میرے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا بے تحاشا شراب پی رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی پلا رہا تھا۔ اس کی بیوی کو گھر سے بھاگے ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ وہ اس صدمہ کو شراب کے نشے میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔
"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے وہ خالی ہاتھ ہی گئی ہے ورنہ میری ساری عمر کی کمائی پہ پانی پھر جاتا"۔

وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا —— اور پھر دوسرا گلاس بھر کر پینے میں مگن ہو گیا۔ نشے میں اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور وہ اپنی ٹانگیں ساتھ کی میز پر رکھے ہوئے تھا۔ اس کی ایک مونچھ نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ اور میں اس کی بیوی کے متعلق سوچنے لگا۔ جو نہ جانے اس وقت کسی کے ساتھ پوری رفتار سے بھاگ رہی ہو گی۔ وہ وہ وقت یاد آیا۔ جب کچھ دن پہلے میری پڑوسن میرے ڈرائینگ روم میں اسی جگہ پر جہاں اس کا خاوند بیٹھا تھا بیٹھ کر گھنٹوں مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی۔ ایسی باتیں جو شاید اس نے اپنے خاوند سے بھی کبھی نہ کی ہوں گی۔

وہ ہر روز رات کو میرے گھر آ جاتی اور دیر تک وہیں رہتی۔ وہ پچیس برس کی ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس کا قد اپنے خاوند سے اگر لمبا نہیں تو اس سے کم بھی نہیں تھا اس کا سارا جسم پتھر کی طرح سخت اور گٹھیلا تھا۔ میں گھنٹوں بیٹھ کر اس کی چھاتیوں کے ابھار کو دیکھتا اور اس کے گھنے بالوں سے کھیلتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے۔ جب میں پہلے پہل اس کالونی میں آیا تھا۔ تو مجھے میرے نوکر نے ایک دن کہا تھا ”صاحب! سامنے والی بی بی جی کہتی ہے

آپ موٹر سائیکل تیز نہ چلایا کریں۔ کہیں چوٹ نہ آجائے"۔
وہ روزانہ کوئی نہ کوئی پیغام کہلوا بھیجتی۔ اور آخر ایک رات کو تاریکی میں میرے گھر بھی چلی آئی۔ اور جب تک بھاگ نہ گئی متواتر آتی رہی۔
اُسے میرے گھر آنے میں ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی۔ اُس کا خاوند نشے میں چور گھر آیا کرتا تھا۔ میری پڑوسن وسکی بھی پی لیا کرتی تھی۔ ایک رات جب میرے گھر آئی تو اس نے وسکی کے دو گلاس پی لیے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ماں باپ کے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی حالانکہ اُسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اس کے خاوند کی پہلی بیوی تھی جسے اس نے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ اپنے خاوند کی شادی کا سنتے ہی ہمیشہ کے لیے اپنے میکے چلی گئی تھی۔
"پھر تمہارا خاوند اتنی رات گئے تک باہر کیوں بھٹکتا رہتا ہے"؟
مجھے یاد ہے میرے اس سوال پر اُس نے خالی گلاس دور اُٹھا کر پھینک دیا تھا اور غصے میں کہا تھا:۔
"بھاڑ میں جائے یہاں پرواہ کون کرتا ہے۔ ہر مہینے پیسے تو بھیج دیتا ہے کم بخت!"

کم بخت - میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک عورت کو اپنے خاوند کے متعلق ایسے سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے سُنا تھا - مجھے یاد آیا کہ اس کا چہرہ غصّے سے لال ہو رہا تھا اور اس کی سُرخ آنکھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہیں سکتی تھیں - اس کے بعد میں نے بات کا موضوع بدل دیا - لیکن اُس کی زبان پر جیسے تالا پڑ گیا ہو - وہ جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو - اُس وقت میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا تھا - مجھے یاد ہے ایک رات جب وہ میرے پاس آئی - تو میں نے دیکھا اُس کی بائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی - اُسے اُس کے خاوند نے مارا تھا - کیونکہ اس نے اُسے اپنے پاس نہ پھٹکنے دیا تھا - اس لئے کہ اُس کے خاوند نے یہ بتانے سے انکار کر دیا تھا - کہ وہ اتنے روز کہاں رہا تھا -

"کیا بیوی کو یہ پوچھنے کا کوئی ادھیکار نہیں؟"

اُس نے یونہی ایک سوال سا کیا اور پھر میرے آغوش میں روتے ہوئے سر ڈال دیا - اور بولی:-

"وہ کہنے لگا - کہ عورت کو یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق نہیں - عورت اپنے خاوند سے صرف کھانے اور پہننے کا مطالبہ کر سکتی ہے - اس سے زیادہ کچھ نہیں - اور جب میں نے اُسے

پاس نہ آنے دیا تو اس نے مجھے پیٹا۔ اور میرے بستر پر چند نوٹ پھینک کر گھر سے باہر نکل گیا۔"

مجھے یاد ہے اس رات میں نے اسے بڑی مشکل سے گھر بھیجا تھا۔ وہ تو میرے ساتھ ہی رہنے کو تیار ہو گئی تھی۔

"اور کیوں نہیں پیتے؟"

میرے پڑوسی نے بوتل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو ایک بوتل باقی ہے۔ اب بھی نہ پیو گے تو کب پیو گے"۔

میں نے وسکی گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا

"جی پی رہا ہوں۔ اور میری راتیں آپ کی بدولت بڑی رنگین رہی ہیں"۔

اس پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور بات کی باریکی کو نہ سمجھ سکا۔

مجھے پھر اپنی پڑوسن کی یاد آ گئی۔ جو نہ جانے اس وقت کس کے ساتھ ہو گی۔ تین دن پہلے وہ رات کو میرے پاس آئی تھی۔ مجھے یاد ہے۔ اس نے آتے ہی مجھے بستر میں جھنجھوڑا تھا۔ اور میرے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ اس رات وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے جسم میں پہلے کی طرح سختی نہیں تھی۔ لیکن چھاتی کا ابھار پہلے

سے زیادہ نمایاں تھا۔ اور اس کی آنکھیں ایسی دکھائی دے رہی تھیں جیسے اُس نے کافی سے زیادہ پی رکھی ہو۔
مجھے یاد ہے اُس رات اس نے پاؤں سے لے کر سر تک زری کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔
"آج کے دن ہماری شادی ہوئی تھی" اُس نے میری گردن میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔
مجھے اُس گھڑی خیال آیا تھا۔ کہ اُسے آج میرے پہلو میں ہونے کی بجائے اپنے خاوند کے پاس ہونا چاہیئے تھا لیکن مَیں نے اُس سے کچھ بھی نہ کہا۔ کیا سب شادی شدہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ مَیں سوچ رہا تھا۔
مجھے یاد ہے۔ اُس نے اُس رات مجھے ایک پل بھی نہیں سونے دیا تھا۔ وُہ مجھ سے اپنے بچپن کی باتیں کہہ رہی تھی۔ جب کہ وُہ اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔ اپنے خاوند کے متعلق تو بات تک بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے مجھے بس اِتنا بتایا۔ کہ وُہ دو مہینوں سے اُس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اور روپے متواتر بھیجتا رہتا تھا۔ اور اُس رات بھی نہ آیا تھا۔ جس رات اُن دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ مجھے اُس وقت خیال آیا تھا۔ کہ نہ جانے اُس کا خاوند کہاں ہوگا اُس وقت۔ مجھے یاد ہے اُس رات

اس لیے مجھ سے سب باتیں کہہ ڈالی تھیں۔
میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے اپنے پڑوسی کو دیکھا۔ جو صوفے پر نشے میں چور آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا ہوا تھا۔ شاید اسے اس وقت اپنی بیوی کے بھاگ جانے کا غم نہیں تھا۔

وہ سویا پڑا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا ——————
کیا میرے پڑوسی کو اپنی بیوی کے بھاگ جانے کا اتنا غم ہے کہ صبح سے بے تحاشا پیئے جا رہا ہے۔ اس کی پہلی بیوی بھی تھی کیا اس نے محبت کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو ٹھکرا دیا تھا؟ یا محض ایک اور عورت کو فریب دینے کے لیے۔ نہیں۔ اگر وہ فریب کر رہا تھا تو اسے اس قدر رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید وہ اس لئے غم زدہ تھا کہ اس کا اعتقاد ٹوٹ رہا تھا۔ کہ عورت کو صرف روپے کے بل بوتے پر محبوس رکھا جا سکتا ہے۔
اس کا یقین ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اسے عورت کے بھاگ جانے کا اتنا غم نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنے اس اعتقاد کے ٹوٹنے کا تھا۔ آج شاید پہلی مرتبہ اسے عورت کی باغیانہ فطرت کا احساس ہوا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں اس نے انگڑائی لی۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے

اسے کیا خیال آیا۔ جاتے ہوئے کہنے لگا:۔

"اونہہ۔ چلی گئی تو کیا ہوا۔ ابھی میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ اس جیسی کوئی اور عورت لا سکوں"۔

وہ اتنا کہہ کر باہر چلا گیا۔ اور اس وقت فوراً میرے منہ سے نکلا ——————"بیچارا!"

بیوہ

دھپ۔ دھپ۔

ریکھا آج صبح سے مالکن کے کپڑے دھو رہی تھی۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں بانہوں کی تیز تیز حرکت سے اُبھر آئی تھیں۔ اس کی اُبھری ہوئی رگوں میں صاف اور شفاف خون دوڑ رہا تھا۔ اُس نے کپڑے دھوتے دھوتے اپنے بازوؤں کی طرف دیکھا۔ وہ ایک عجیب انداز سے چمک رہے تھے۔

وہ پسینے اور صابن کی جھاگ سے بھرپور تھے۔ اُسے اپنے بازو آج بہت بھلے لگے۔ اُس کا جی چاہا۔ کہ وہ انہیں ایک بار چوم لے۔ شلوار نچوڑتے ہوئے اُس کے ہاتھ

خود بخود رک گئے۔ اور اس نے اپنے ہونٹ اپنے دائیں بازو کی پچھلی پر رکھ دیئے۔ لیکن صابن کی جھاگ کے ذائقے نے اس کا سارا مزا کرکرا کر دیا۔ اس نے جلد ہی سے اپنے لرزتے ہوئے ہونٹ اپنے دائیں شانے سے پونچھے اور پھر اس کے ہاتھ خود بخود کام میں لگ گئے۔
وہ کپڑے دھوتے ہوئے کبھی نہیں تھکا کرتی تھی۔ اس لیے کہ اس طرح اسے ایک جگہ بیٹھ کر کچھ سوچنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ وہ اپنے سارے کپڑے اتار کر غسل خانے کا دروازہ بند کر لیتی۔ اور کپڑے دھوتی رہتی۔ لیکن اس کا دماغ ان گنت خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا۔
آج دو سال ہو گئے تھے اس کو بیوہ ہوئے۔ دو سال پہلے اس کے بالوں میں سیندور کی لکیر معدوم ہو گئی تھی۔ اس کا پتی کوئلے کی دہکتی ہوئی کان میں بھسم ہو گیا تھا۔ اس وقت اسے پتہ چلا کہ اس کا پتی ہی نہیں۔ بلکہ اس کا ان داتا بھی چل بسا تھا۔ لیکن چند دنوں کے بعد اسے ایک اور بات کا بھی احساس ہوا۔ کہ اس کے خاوند کی موت کے ساتھ ساتھ اس کی تمناؤں اور اس کے جذبات کا بھی خون ہو گیا تھا۔ ایسی تمنائیں جو ہر عورت کے شباب میں قدم رکھتے ہی ان میں موجود ہوتی ہیں اور جن کو آسودگی ان کے شوہروں کی آغوش میں نصیب ہوتی ہے۔

وہ ہمیشہ یہی سوچتی رہتی کہ کیا وہ ہمیشہ یونہی اُداس غمگین اور بجھی بجھی رہے گی۔ "کیا میرے جیون میں پھر کبھی بہار آئے گی کہ نہیں؟"

آج بھی وہ یہی سوچ رہی تھی اور کپڑے دھوئے جا رہی تھی۔ وہ کچھ اُداس سی ہو گئی۔ صابن کی جھاگ کے خراب ذائقے نے اُسے اس کی بے مزہ زندگی کی یاد دلا دی جس کا ذائقہ بالکل صابن کا سا تھا۔ دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے گالوں پر سے بہتے ہوئے ٹپ ٹپ کرتے ہوئے گیلی زمین پر آ گرے اور صابن کا پانی انہیں اپنی رَو میں بہا لے گیا۔

اُس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔ پچیس سال کی نوجوان ریکھا اپنے آپ کو ایک بڑھیا نظر آنے لگی۔

اُسے وہ پرانا وقت یاد آیا۔ جب کہ وہ خوبصورت تھی اور اس کا جسم سڈول تھا۔ اُسے یاد آیا کیسے وہ سارا سارا دن گاؤں کے کھیتوں میں گھومتی رہتی۔ اور پھر جب اُس نے ہوش سنبھالا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ اُس کے کام میں ہاتھ بٹاتی رہی۔ اپنے خاوند کے گھر میں ہر روز صبح دو بجے اُٹھتی۔ امید اُس کے کان میں جانے سے پہلے اُسے چائے بنا کر دیتی۔ اُسے اس وقت ایسا محسوس

ہوتا تھا کہ وہ کبھی بوڑھی نہ ہوگی۔ لیکن وہ تو ایک خواب تھا۔ اس کے پتی کی موت کے بعد اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی آدھی جان اس کے بدن سے نکل گئی ہو۔

اسے اپنے پتی کی جدائی کا بہت غم تھا۔

اسے اگر اچھی اور مہربان مالکن نہ ملی ہوتی تو نہ جانے وہ کیا کرتی۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتی۔ مہیش بابو اور اس کی مالکن کی شادی ہوئے ابھی دو ہی مہینے ہوئے تھے۔ وہ ریکھا پر بڑا ترس کھاتے کیونکہ وہ دکھیاری تھی۔ ایک بیوہ تھی۔

ریکھا کو بھی اب اپنی مالکن سے کچھ محبت سی ہو گئی تھی۔ وہ جی لگا کر کام کرتی۔ ....

مالک سے تو وہ بہت کم باتیں کیا کرتی۔ مہیش تو صبح اٹھتے ہی دفتر کا کام کرنے لگ جاتا۔ اور دس بجتے ہی دفتر بھاگ جاتا اور پھر شام کافی دیر سے گھر لوٹتا۔ اور تب وہ ان کے کمرے کی طرف نہ جایا کرتی۔ کیونکہ وہ دونوں اس کی موجودگی میں ذرا شرماتے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ خود آج سے دو سال پہلے نوکروں کے سامنے خاوند سے بات کرتے ہوئے شرمایا کرتی تھی ——— ہاں بالکل ویسے ہی .... اسے یاد آیا۔ ایک دن جب وہ اپنے پتی کے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں کر رہی تھی اور اس کی ماں اچانک

اندر آ گئی تھی تو اُسے کتنی شرم آئی تھی۔ پھر وہ اپنی ماں کے سامنے آنکھیں بھی نہیں اُٹھا سکی تھی۔

وہ کپڑے دھوئے جا رہی تھی۔ اور اس نئے شادی شدہ جوڑے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر اُس کے دِل میں اُمنگوں کی ایک لہر اُبھر آتی۔ اُسے اپنا وقت یاد آتا۔ مالکن کے مہندی رچے ہاتھوں میں اُسے اپنی تمناؤں کا خون دِکھائی دیتا۔ اُس کا بھی دِل چاہتا...... کاش اُس کے بھی ہاتھ رنگے ہوئے ہوتے۔ وہ مالکن کے چہرے پر موجِ مسرّت دیکھ کر گہرے خیالات کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتی۔ مالکن کے چہرے کی یاد آتے ہی اُس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ اُس کے دِل میں بھی خواہش پیدا ہوتی۔ کہ اُس کے چہرے پر بھی خوشی ناچے۔ وہ بھی کِسی کے بازوؤں میں جھُولے۔ اُس کی اُجڑی ہوئی دُنیا پھر سے آباد ہو....

وہ سوچنے لگی۔ ”کیا گناہ کیا ہے مَیں نے۔ کہ مَیں صرف چند لمحوں کے لئے ہی جیون کی نایاب خوشیوں سے سرشار ہو سکی“

آج اُسے اِس نئے گھر میں آئے ہوئے ڈیڑھ مہینہ ہو چلا تھا۔ پہلے پہل تو مہیش اور اُس کی بیوی ریکھا کی موجودگی میں کم ہی باتیں کیا کرتے۔ لیکن جُوں جُوں دِن گذرتے گئے وہ ریکھا کو اپنے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگے۔ اور ریکھا کی

موجودگی میں ایک ہی بستر میں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے۔ اور کئی دفعہ تو اس کے سامنے ہی اس کی مالکن اپنے پتی کے زانو پر سر رکھ کر پتی کے پریم کا آنند لیتی۔ شاید مہیش اور اس کی بیوی کے لئے اب رکمنی ایک کاٹھ کی پتلی کے برابر تھی۔ جس میں کوئی زندگی نہ ہو۔ وہ اب اس کے سامنے بالکل نہ ہچکچاتے۔ پہلے جب وہ ان کے ہاں آتی تھی۔ تو وہ ان کے سونے کے کمرے میں نہیں جایا کرتی تھی۔ وہ دروازے تک جاتی اور پھر پلٹ آتی۔ یا آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاتی اور کہتی۔ "بی بی جی! چائے لائی ہوں"

تب وہ چائے وہیں دروازے کے پاس رکھ کر چلی جاتی۔ اور اس کی مالکن خود اٹھا کر اندر لے جاتی۔ کئی دفعہ تو دروازہ بند ہی رہتا۔ اس وقت اس کے دل میں ہیجان برپا ہو جاتا اور وہ بھاگ کر باورچی خانے میں چلی جاتی۔ اور اپنے آپ کو دیکھتی۔ اپنے جسم کے ایک ایک انگ کو دیکھتی۔ اور اپنے جسم کا مقابلہ اپنی مالکن کے جسم سے کرتی۔ اسے اپنے شریر میں اسی قسم کی شگفتگی نظر آتی۔ جیسی کہ اس کی مالکن کے شریر میں تھی۔ وہ باورچی خانے کا دروازہ بند کر کے گھٹنوں اندر بیٹھی اپنے سب کپڑے بار بار اتار کر پہنتی۔ وہ اپنے آپ بول اٹھتی۔ "کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟ کیا میں جوان نہیں ہوں؟

کیا خوبصورت کپڑے میں نہیں پہن سکتی ۔ کیا مجھ میں خواہشیں نہیں ہیں ......"

لیکن پھر اُسے اپنا بیوہ ہونے کا خیال آتا ۔ اور اُس کا رنگ زرد پڑ جاتا ۔ اُس کی سب خواہشیں مٹ جاتیں جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو ——— کیوں کہ اُسے بتایا گیا تھا کہ بیوہ ہو کر خواہشوں کا اظہار تو ایک طرف ان کا خیال کرنا ہی پاپ تھا ۔ وہ ایک ایسا قصور تھا جسے بھگوان خود بھی معاف نہیں کر سکتے تھے ......

ریکھا کے خاوند کے مرنے کے ایک سال بعد اُس کے دوست نے ریکھا کے ماں باپ سے شادی کے لیے کہا تھا ۔ لیکن انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا ۔ لیکن اب تو وہ بھی چل بسے تھے ۔

وہ سوچ رہی تھی اور تیزی سے کپڑے دھو رہی تھی ۔ اُسے اپنی حالت پر رحم آ رہا تھا ۔ وہ سوچ رہی تھی "کیا باقی زندگی بھی یونہی ارمانوں کو کچلتے ہوئے گزر جائے گی؟"

یکایک پاس کے کمرے میں مالکن کی ہنسی کی آواز سنائی دی ۔ آج مہیش بابو اور اُس کی بیوی دونوں صبح سے اُس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ مہیش کا دفتر آج بند تھا ۔ ریکھا کے دل پر مالکن کی ہنسی سانپ بن کر لوٹ رہی تھی ۔ اُس کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ۔ اُس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے ۔ اور چہرہ سرخ ہو گیا ۔ اُس

نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تولیئے کو اور تیزی سے نچوڑنا شروع کر دیا۔ اس نے اتنا زور لگایا۔ کہ اس کے ہاتھوں میں درد ہونے لگا۔ لیکن پھر بھی وہ اسے نچوڑے جا رہی تھی۔ اس نے تولیئے کو ایک طرف رکھ دیا۔ اور زور زور سے ہاتھوں کو ملا۔ اس کے ہاتھ لال ہو گئے۔ ہاتھوں کی لالی میں اُسے خوشی کی ایک جھلک نظر آئی۔ اسے اُمید ہو گئی۔ کہ زندگی ابھی اُس میں باقی ہے۔ مالکن کی ہنسی دھیرے دھیرے بلند ہوتی گئی۔ اور ریکھا کا اضطراب بھی۔ اس نے کپڑے دھونا بند کر دیئے۔ اور ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی اُس نے جلدی جلدی ٹھنڈا پانی اپنے اوپر اُلٹنا شروع کر دیا اور اپنے جسم کو ملنے لگی۔ اس نے اب دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اب وہ خواہشوں کو دبائے گی نہیں ———— ایک دم ساتھ کے کمرے سے پھر ہنسی بلند ہوئی۔ اور اس دفعہ ریکھا سے نہ رہا گیا۔ اُس نے غسلخانے کے دروازے کے ایک سوراخ میں سے جو کہ اس کی مالکن کے سونے کے کمرے کی طرف کھلتا تھا جھانک کر دیکھا اور کافی دیر تک دیکھتی رہی ..... اس کی مالکن پتی پریم کا آنند پا رہی تھی۔ یہ اس کے جذبات پہ آخری ضرب تھی ———— ریکھا کو ایک پھریری سی آئی اور وہ سب کچھ بھول گئی۔ اسے یہ بھی بھول گیا کہ وہ ایک بیوہ تھی۔ اُسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ ایک عورت تھی۔ اور احساس رکھتی تھی اور یہی اس کے لیئے کافی تھا۔ اس نے جلدی سے کپڑے پہنے اور باہر آگئی۔ اُس وقت اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس نے مالکن سے چار روز کی چھُٹی لی۔ اور گاؤں کی طرف چل نکلی۔ جب وہ لوٹی تو اُس کے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔

پسینے کے قطرے

"اگر اس مہینے زیادہ مال تیار ہوا تو سب کی تنخواہ بڑھا دی جائے گی"۔
بنسی بھٹی کے ساتھ لٹکے ہوئے پوسٹر کی طرف دیکھتا ہوا دہکتی ہوئی
آگ میں کوئلہ جھونک رہا تھا۔ پوسٹر کو دیکھ کر اس کے بازوؤں میں پہلے
سے زیادہ چستی اور طاقت آگئی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر تنخواہ بڑھ جائے
تو وہ سب سے پہلے اپنے بھائی کا اچھی طرح سے علاج کرے گا جس کے
پھیپھڑے کوئلے کے دھوئیں کی وجہ سے چھلنی ہو گئے تھے۔ نہ جانے اس کے
پھیپھڑے کتنا دھواں پی گئے تھے۔ اس کی کھانسی بند ہی نہیں ہوتی تھی۔
اور اس کی تھوک بھی تو کالی تھی۔ وہ اب ایک ہڈیوں کا پنجر بنا ہوا اس
کے گھر میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پہ موت کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔

اس سے تین سال پہلے اس کا ایک اور چھوٹا بھائی بھی اسی کھانسی کی مرض سے چل بسا تھا۔ فیکٹری کے ڈاکٹر نے بتایا تھا۔ کہ یہ مرض اب اس کے خاندان میں داخل ہو چکا تھا۔ بنسی ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے بھائی کا علاج کروایا جائے۔ تاکہ اُس کا اثر باقی گھر والوں پہ نہ ہو۔

اور اب تنخواہ بڑھنے کی اُمید نے اُس کے دل میں ایک نئی اُمید پیدا کر دی۔ اور وہ تیزی سے کام کرنے لگا۔ اُس کے ہاتھ اب پہلے سے دُگنا کوئلہ آگ میں جھونکنے لگے۔ اور وہ سوچنے لگا میں جتنا کام زیادہ کروں گا اُتنا ہی مال زیادہ بنے گا۔

"تیز تیز ہاتھ چلاؤ۔"

فورمین نے چلاتے ہوئے کہا۔ بنسی کے ہاتھ خود بخود رُک گئے۔ اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ فورمین کالے لباس میں ملبوس ماتھے پہ بل ڈالے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔! کل تک تو یہ اچھا بھلا تھا۔ آخر وہ انہی میں سے ایک تھا۔ چند ہی دن ہوئے تھے اُسے فورمین بنے ہوئے۔ اس کے لہجے میں درشتی کیوں آگئی تھی۔ فورمین ہمیشہ اُن کا لیڈر رہا تھا لیکن تب وہ پیار سے اُن کو سمجھایا کرتا تھا۔ اور وہ کتنی عزت کیا کرتے تھے اُس کی۔ فیکٹری مینجر بھی اُس سے ڈرتا تھا..... اور مالک تو اس کا نام سنتے ہی کانپ اُٹھتا تھا۔ لیکن جب سے وہ فورمین بن گیا تھا۔ وہ نہ تو اب انہیں پیار سے بُلاتا اور نہ ہی سمجھاتا۔ آخری ہڑتال میں تو اس کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ کہ وہ کہاں ہے۔؟ "کیشو خرید لیا گیا ہے۔" اس

جملے کا مطلب اُس کی سمجھ میں اب آیا۔ اس سے پہلے اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو کیسے خرید سکتا ہے۔ کلشو کا ہڑتال میں شامل نہ ہونا اب اس پر ظاہر ہوا۔ وہ اب ان کا لیڈر نہیں رہا تھا۔ بلکہ فیکٹری کا چھوٹا منیجر تھا۔ جسے گالیاں نکالنے اور سختی کے ساتھ بولنے کا حق مل گیا تھا۔ اس نے فورمین کے چہرے کو گھور کر دیکھنا شروع کیا جو اب دوسرے کام کرنے والوں کو حکم سنا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے چہرے پر کوئی جلال نہیں تھا۔ اس کے پچکے ہوئے رخسار بھر گئے تھے۔ اس کی آنکھیں اب چمک اٹھی تھیں۔ اب ان میں کوئلے کے دھوئیں کے مرغولے نہیں رہے تھے۔ وہ خوش نظر آرہا تھا بنسی نے محسوس کیا۔ کہ فورمین کا قد بھی اب بڑھ گیا تھا پہلے پہلے جب وہ فیکٹری میں کام کرنے آیا تھا۔ تو اس کی کمر کچھ جھکی جھکی سی تھی۔ اور اس کا پیٹ اس کی ریڑھ کی ہڈی سے باتیں کر رہا تھا۔ مگر اب اس کے جسم پر گرفت نظر آرہا تھا۔ اور اب اس کی آواز میں گرج پیدا ہو گئی تھی لیکن اس گرج میں وہ طاقت نہیں تھی۔ جس کے سامنے فیکٹری کا مالک بھی جھک جایا کرتا تھا۔ اتنی بڑی فیکٹری کا مالک۔ وہ فیکٹری جس میں تقریباً تین ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ اس فیکٹری کا مالک ہزاروں آدمیوں کو پالتا تھا۔ اس نے فیکٹری کے مالک کو صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ فیکٹری سے نکل کر اپنی موٹر میں گھر جا رہا تھا۔ دراصل فیکٹری کا مالک ان کے لئے ایک معمہ تھا۔ وہ سالے

اُس کے متعلق سوچتے رہتے۔ کوئی کہتا۔ وُہ دبلا پتلا سا ہے۔ اور کوئی کہتا وُہ بہت موٹا ہے۔ اور کبھی تو اُسے لنگڑا بتاتے تھے۔ کتنا خوش نصیب ہے یہ فیکٹری کا مالک۔ بنسی سوچنے لگا۔ نہ اُسے محنت کرنی پڑتی ہے اور نہ ہی وُہ مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار کرتا ہے۔

"بنسی! تم کام کیوں نہیں کر رہے؟"

بنسی مسکرایا اور پھر کوئلہ جھونکنے لگا۔ اُس نے اپنے کوئلے کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ ابھی کافی کوئلہ اور ڈالنا تھا۔ اُس کے ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگے۔ آگ کی تپش کافی بڑھ چکی تھی۔ اُسے اب پیچھے ہٹ کر کوئلہ ڈالنا پڑ رہا تھا۔ اُس کا سارا جسم اب لال ہو گیا تھا اُس کا زرد چہرہ تپتے سُورج کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس کی رگوں میں خون اُبلنے لگا اُس کے پٹھے پھُول گئے۔ اور وُہ پسینے میں شرابور کوئلہ پھینکے جا رہا تھا اُس کے جسم سے پسینہ بہہ بہہ کر زمین پر گرنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وُہ ابھی ابھی پانی میں غوطہ لگا کر نکلا ہو۔ وُہ پسینہ اُسے ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ اور یہ ٹھنڈک اُسے بھلی لگ رہی تھی۔ وُہ ہمیشہ اپنا مُنہ کھول دیتا۔ اور جب پسینہ اُس کی زبان پر گرتا۔ تو اُسے بڑا مزہ آتا اُس پسینے سے اُسے ذرا بھی بُو نہ آتی۔ رات کو جب کبھی وُہ اپنی بیوی کے نزدیک سوتا۔ تو وُہ ہمیشہ کہتی۔ کہ اُس سے پسینے کی بُو آتی ہے۔ لیکن وُہ ہمیشہ اس سے کہا کرتا "پگلی تو جانتی نہیں۔ اسی پسینے کی کمائی تو ہم کھاتے ہیں!" تب اُس کی بیوی چپ ہو جاتی۔ دراصل جب تک اُسے اچھی طرح

پسینہ نہ آجاتا وہ سمجھتا اس نے ابھی تک پورا کام کیا ہی نہیں ہے حالانکہ فیکٹری کا منیجر تو اس کے کام کا اندازہ کوئلوں کے ڈھیروں سے لگایا کرتا تھا۔ لیکن اس کے اپنے امتحان کا طریقہ ہی اور تھا۔ جس رات اسے بہت پسینہ آتا اس رات اسے اچھی طرح نیند آتی۔ اور بھی تو ایک چیز تھی جس کے سہارے وہ جی رہا تھا۔ اسے بالکل پروا نہ تھی۔ کہ اسے اتنا کام کرنے کے باوجود بھی اتنی تھوڑی اجرت ملتی تھی۔ اس کے لئے تو بس اتنا کافی تھا۔ کہ وہ اپنا فرض خوبی سے ادا کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ غصے میں جھنجھلا اٹھتا۔ لیکن پھر چپ ہو رہتا۔ نسی کو امید تھی کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنی محنت کا پھل ضرور ملے گا۔ وہ اسی امید پر جی رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ زیادہ کام کرنے سے ایک نہ ایک دن اس کی اجرت بڑھ جائے گی۔ تب ان کی تمام مشکلیں دور ہو جائیں گی۔

وہ تیزی سے کوئلہ جھونک رہا تھا۔ آگ کی تپش پہلے سے بڑھ چکی تھی۔ اس کا بدن اب جلنے لگا۔ لیکن اسے چنداں پروا نہ تھی۔ کبھی باہر آگ کی چنگاریاں اڑ اڑ کر آتیں اور اس کے بازوؤں کے بالوں کو جھلس جاتیں۔ لیکن اسے بالکل پروا نہ ہوتی۔ آج بھی چنگاریاں تیزی سے اڑ اڑ کر اس کے قریب گر رہی تھیں۔ مگر اسے فکر ہی نہ تھی۔ اس کا یقین تھا۔ کہ آگ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی کیونکہ وہ دن رات آگ ہی سے تو کھیلتا تھا۔ اس کے ہاتھ اسی تیزی

اور پھرتی سے کام کرتا رہے۔ اُسے بس یہی لگن تھی کہ وہ سب سے زیادہ کام کریگا۔ تاکہ مال زیادہ بنے۔ سامنے لٹکے ہوئے پوسٹر نے اُس کے مُردہ جسم میں ایک نئی رُوح پھونک دی تھی۔ حالانکہ فیکٹری میں تین سال سے کام کرتے کرتے اب وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اور پھر اُسے سب کچھ بے مزہ لگتا۔ جہاں بھی جاتا اُسے کوئلے کی طرح سب چیزیں کالی نظر آتیں۔ جب وہ کھانا کھاتا۔ تو اُسے کوئلے کا ذائقہ محسُوس ہوتا۔ پانی پیتا۔ تو اُس میں بھی کوئلے کی گرد کا ذائقہ محسوس ہوتا۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتا۔ کہ اُس کی زندگی میں کیا کوئلے ہی لکھے ہوئے ہیں؟ اس کا منہ ہر وقت کوئلے کی گرد سے اَٹا رہتا۔ اور ہاتھوں سے تو میل اُترتی ہی نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی نہ کُڑھتا۔ کیونکہ اُسے اُمید تھی۔ کہ اُس کے بھلے دِن ضرور آئیں گے اور اُسے ترقی ملے گی۔ اُس کی تنخواہ بڑھے گی۔ تنخواہ کے بارے میں وہ اب بھی سوچ رہا تھا۔ اُس کی ساری اُمیدیں تنخواہ ہی سے بندھی ہوئی تھیں۔ اور اب جب کہ ایک پوسٹر بھی نکل آیا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ مالک بھی کتنا اچھا آدمی ہو گا۔ کم از کم اُسے مزدوروں کا خیال تو آتا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ مالک کوئی دیوتا ہو گا۔ مگر اچانک اُسے فورمین کا خیال آیا جس کے لہجے میں کڑواہٹ ہی کڑواہٹ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ مالک کے خاص آدمی، جو کہ مزدوروں اور فیکٹری کے منتظم ہیں اتنے گستاخ ہو سکتے ہیں تو یقیناً مالک بھی کوئی دُوکھا سا انسان ہو گا۔ ورنہ اُن کی اتنی جُرأت نہ ہوتی۔ کبھی کبھی تو وہ

سوچا کرتا تھا کہ محنت کر کے وہ فورمین بن جائے گا۔ مگر آج اسے اس ترقی سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ اُسے محسوس ہوا۔ کہ فورمین بننا اپنے آپ کو بیچنا ہے جیسا کہ کلیشو نے کیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو بیچنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ وہ کسی کی غلامی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اور آج وہ سوچ رہا تھا کہ فورمین بننا ایک بہت بڑی ذلت ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا۔ کہ وہ ایک معمولی مزدور ہی رہے گا۔

اُس کے ہاتھ اور تیزی سے کام کرنے لگے۔ اُس نے نظریں جھکا کر اپنے بازوؤں کی طرف دیکھا۔ بالکل اسی طرح خود بخود کام کر رہے تھے۔ جیسے ساتھ ہی فیکٹری کے ہال میں چلنے والی مشینوں کے پہیے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان مشین کے پہیوں اور اُس میں کیا فرق ہے! لیکن پھر اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ مشینوں کی دیکھ بھال زیادہ کی جاتی تھی۔ کل ہی کی تو بات تھی۔ کہ اُس کے پاس دو آنے بھی نہیں تھے کہ تھوڑا سا تیل خرید کر اپنے بازوؤں پہ مالش کرے جو زیادہ کام کرتے کرتے تھکے جا رہے تھے۔ اور ان مشینوں کو روزانہ تیل پلایا جاتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اور کوئلہ ڈال رہا تھا۔ یکایک اُس نے محسوس کیا کہ کوئلوں کی ڈھیری بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ فورمین کلیشو اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ہنسی کہہ کر اُسے غصہ آیا۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کہ کوئی اُس کا مذاق اُڑائے۔ اُس

کے جی میں آیا۔ کہ بیلچہ اٹھا کر کیشو کے سر میں دے مارے۔ لیکن پھر وہ نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو رہا۔ وہ کیشو کی شرارت کو سمجھ گیا تھا۔ لیکن شاید کیشو کو اس کی قوتِ ارادی کا علم نہیں تھا۔ اور پھر آج تو اس میں پہلے سے زیادہ طاقت آگئی تھی۔ اس نے ڈھیری کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی نگاہیں پوسٹر پر پڑیں۔ اس نے ہمت باندھی۔ اور سانس کھینچ کر کوئلہ جھونکنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ اب پہلے سے تیز رفتار سے کام کر رہے تھے۔ کوئلے کی ڈھیری کم ہوتی شروع ہو گئی۔ کیشو اور باقی کے مزدور اس کے گرد ایک حلقے کی صورت میں جمع ہو کر دیکھ رہے تھے۔ چھٹی کی گھنٹی بج چکی تھی۔ مگر نسی کو اس کی خبر ہی نہ تھی۔ اور نہ ہی اسے اپنے گرد جمع ہوئے لوگوں کا علم تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا۔ کہ وہ آج سارا کوئلہ بھٹی میں ڈال کر ہی جائے گا۔ ڈھیری کم ہوتی گئی۔ اور ختم ہو گئی۔ مزدوروں کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ رحیم آگے بڑھا۔ اور اس نے نسی کو گلے لگا لیا۔

نسی نے قمیض اٹھائی اور مزدوری لینے کے لئے مینجر کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

مینجر نے پہلے کی طرح تین روپے اس کی مٹھی میں رکھ دیئے۔ نسی کچھ بولنے ہی والا تھا۔ کہ مینجر نے یہ وڈکش کی سوئی کی طرف اشارہ کیا جو آج سے چھ مہینے پہلے کی طرح اسی جگہ پر تھی۔ کیشو نے روپے اپنی قمیض کی جیب میں ٹھونسے اور چلنے ہی والا تھا۔ کہ فورمین کیشو

کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بنسی بڑی پھرتی سے مڑا۔ اس نے ایک گھونسا کیشو کے منہ پر ایسا جمایا۔ کہ وہ لڑھکتا ہوا منیجر کی کرسی پر جا گرا۔

جوتے

(ایک ریڈیائی ڈرامہ)

ڈرامے کے لوگ

راجن	ایک نوجوان
آشا	راجن کی بیوی
رام جوزف پرکاش	راجن کے دوست

اور ایک ڈاکٹر

جُوتے

راجن۔ کلّو کی ماں۔ ارے او کلّو کی ماں! کہاں ہے تو؟
آشا۔ رومال دھو رہی ہوں تمہارے۔ (دُور سے)
راجن۔ کیا عجب قسم کی عورت ہے یہ۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی ہے۔ بھلا آرام بھی کیا کرتی ہو کبھی!
آشا۔ کیا آرام کروں گی میں۔ تو کہہ تو رکھ کر نہیں دیتے اور باتیں اتنی!
راجن۔ کیا بیکار باتیں لے بیٹھی ہو تم اس وقت۔ اور جبکہ ہم GOOD MOOD میں ہیں۔ ہاں تو ذرا میرے جُوتے تو لے آنا۔
آشا۔ لاتی ہوں۔ کہاں رکھے ہیں؟
راجن۔ ارے جُوتے بھلا شو ریک میں نہیں تو کیا باورچی خانے میں ملیں گے۔

عجیب قسم کی عورت ہو تم۔ ذرا سی کامن سینس کی بات نہیں سمجھتی۔

آشا۔ دیکھو جی بند کرو یہ اپنی گیٹ مٹ۔ اور سیدھا ہندوستانی میں بات کیا کرو۔ ورنہ یاد رکھو میکے چلی جاؤں گی۔

راجن۔ بات بات پر اتنی دھمکی۔ ارے بھگوان یہ کیا غضب ہے۔ ایک لفظ انگریزی کا بولنے کی اجازت نہیں۔ خیر پھر سے انگریزی میں ٹاک یعنی۔ یعنی گفتگو نہیں کیا کریں گے۔ اچھا اب جوتے تو لاؤ۔

آشا۔ لاتی ہوں۔ ذرا یہ رومال سوکھنے ڈال دوں۔

راجن۔ تو کیا یہ کام بعد میں نہیں ہو سکتا۔ میرے سیر کرنے کا وقت قریب آتا جا رہا ہے۔ اور آپ ہیں کہ کچھ پرواہی نہیں کرتیں۔ خیر سمجھ لوں گا پھر مانگنا ساڑھی ہم سے۔ مجھے سینڈل لا دو۔ (چڑاتے ہوئے) مجھے سینڈلے چاہیئے۔ مہینوں تک نہ انتظار کروایا۔ تو نام راجن نہیں۔

آشا۔ (غصے میں) ارے تم کیا لا دو گے ساڑھی واڑھی۔ سلامت رہیں یہ ہاتھ پاؤں۔ خود جا کے لے آؤں گی۔

راجن۔ اتنی بے عزتی ہماری۔ راجن بابو کی بیوی اور بازار میں جا کر ساڑھیاں خریدے۔ خبردار جو کبھی اکیلی بازار گئی تو۔ ہاں یاد رکھو۔ نہیں تو بھوک ہڑتال کر دوں گا میں۔

آشا۔ تو کر دو۔ میں تو میکے چلی جاؤں گی۔

راجن۔ خیر چھوڑو اس مذاق کو۔ لاؤ وہ ہمارے جوتے تو ذرا لا دو۔

(اتنے میں بچے کے رونے کی آواز آتی ہے)

آشا۔ خود ہی اُٹھا لو۔ کلو جاگ پڑا ہے۔

راجن۔ کیا مصیبت ہے کبھی رومال دھونے جا رہے ہیں تو کبھی کلو کو اٹھایا جا رہا ہے۔ اور شوہر بیچارا صبح سے جوتے جوتے کر رہا ہے لیکن مہارانی کے کانوں تک ہماری فریاد ہی نہیں پہنچتی۔ خیر ہم عہد کرتے ہیں اگر جوتے تم اٹھا کے لا دو گی تو پہنینگے ورنہ ننگے پاؤں ہی چلے جائینگے

آشا۔ (روتے بچّے کو گود میں کھلاتے ہوئے) کس انسان سے پالا پڑا ہے جو اپنے جوتے تک خود اٹھا کر نہیں پہن سکتا۔ میں بھی جوتے نہیں اٹھاؤں گی آج۔

راجن۔ تو ہم بھی بیٹھے ہیں سمادھی لگائے۔ سب دوستوں سے کہہ دیں گے کہ آج جمنا کنارے کی سیر نہیں ہو گی۔

آشا۔ بڑی اچھی بات ہے۔

راجن۔ (ایک دم غصّے میں چلّاتے ہوئے) میں کہتا ہوں مہارانی میرے جوتے لاؤ۔ ورنہ میں خودکشی کر لوں گا پہاڑ سے چھلانگ لگا دوں گا چلتی ہوئی گاڑی کے نیچے آ جاؤں گا۔ کھانا نہیں کھاؤں گا۔

(دروازے پر زور سے دستک)

راجن۔ بھائی کون ہے؟ اندر آ جاؤ۔ اتنے زور سے کھٹ کھٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

رام۔ (اندر داخل ہوتے ہوئے) ارے بھائی کیوں۔ ذرا اطلاع تو دینی چاہیے اپنی آمد کی۔ کیا تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ اور تمہارا

مُنہ یہ کیوں سُرخ ہو رہا ہے؟

راجن - اپنی بھابی سے پوچھو دو گھنٹے سے چلّا رہا ہوں کہ ہمارے جوتے لا دو - لیکن یہ ہیں کہ انہیں ہمارے کاموں کے لئے فرصت ہی نہیں

رام - ارے بھائی تو یہ کونسی بڑی بات تھی - خود ہی کیوں نہ اٹھا لئے

راجن - (گھورتے ہوئے) دیکھو جی تم بھی اپنی بھابی کی طرفداری کرنے لگے - ہائے رے زمانہ - اے فلکِ کج رفتار - تیرا یہ ستم اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا میرے عزیز دوست بھی اب مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہیں - اے نیلی چھتری والے! تیری قسم میں ڈوب مروں گا - جان دے دوں گا -

رام - اُف میرے بھگوان - یہ کیا ہنگامہ ہے ---- بگڑنے کی بات کونسی ہے لاؤ جوتے میں ہی لائے دیتا ہوں - مگر یہ اپنی ہائے وائے بند کرو - اچھّا بولو کہاں رکھتے ہیں؟

راجن - پھر وہی سوال بھلا جوتے شو ریک کے سوا کہیں باورچی خانے میں ملیں گے -

رام - ارے بھائی بندے کے پاس شو ریک وِیک کہاں ہم تو اپنے جوتے سوتے وقت جھاڑ پونچھ کر سرہانے رکھ کے سو جاتے ہیں -

راجن - اچھّا اب تم بھی اپنی بھابی کی طرح زیادہ باتیں نہ بناؤ - اور جوتے اٹھا لاؤ -

رام - (تالی بجاتے ہوئے) ضرور - ضرور - اچھّا بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمہارا

شوٗ رَیک رکھا کونسے کمرے میں ہے؟

راجن ۔ رام بھئی سچ بتاؤ آج کیا کھا کے آئے ہو۔ میرے گھر کا ایک ایک کونہ جانتے ہو۔ اور تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ شوٗ رَیک کہاں رکھا ہے خیر کہیں سامنے کے کمرے میں ہوگا۔

رام ۔ تو یوں کہو میاں لال بجھکڑ کہ تمہیں خود بھی معلوم نہیں کہ تمہارا شوٗ ریک کہاں رکھا ہے۔ عجیب انسان ہو تم بھی!

راجن ۔ خیر اب بیکار وقت ضائع نہ کرو۔ اور جوتے اٹھا لاؤ۔

رام ۔ جا رہا ہوں بھئی۔ تم تو آج جیسے سبز مرچیں کھا کے بیٹھے ہو۔

(وہ دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے اور وہیں سے پکارتا ہے)

رام ۔ تمہارے بوٗٹ تو یہاں نہیں ہیں!

راجن ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ٹھہرو۔ میں خود دیکھتا ہوں۔

(خود اٹھ کر دوسرے کمرے میں رام کے پاس جاتا ہے)

راجن ۔ ارے ہاں یار بوٗٹ تو یہاں نظر نہیں آتے۔ ٹھہرو۔ بھلا کلّو کی ماں سے پوچھتا ہوں۔ (پکارتا ہے) کلّو کی ماں۔ کلّو کی ماں! ارے کہاں ہے تو۔ ہوں تو یہ بھی غائب ہو گئی ———— گئی ہو گی اپنی سہیلی رنجنا کے گھر میری شکایت کرنے۔ عجب قسم کی عورت ہے یہ۔ خیر رام اب تو تم ہی میری مدد کرو۔ میرے جوتے نہ جانے کہاں کھو گئے۔

رام ۔ ہاں ہاں بھئی گھبراؤ نہیں۔ یہیں کہیں بھابی نے رکھ دیئے

ہوں گے۔ ابھی ڈھونڈھ نکالیں گے۔

(چیزوں کو الٹنے پلٹنے کی آواز)

رام ۔ (ہنستے ہوئے) بھئی تمہارے جوتے تو ملتے نظر نہیں آتے۔

راجن ۔ تو کہاں جا سکتے ہیں وہ۔

رام ۔ ارے بھائی کل چاندنی رات تھی ۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا

راجن ۔ تم بھی عجب قسم کے انسان ہو۔ چاند اور چاندنی کا ذکر لے بیٹھے۔

رام ۔ تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ کل چاندنی تھی اور چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ تمہارے جوتوں کا دل بھی سیر کرنے کو چاہا ہو گا۔ وہ اس کھڑکی سے بھاگ نکلے ہوں گے۔ کہیں کسی خوبصورت جھاڑی میں آرام کر رہے ہوں گے۔ جوتوں کو بھی سیر کرنے کا موقع دینا چاہیئے بیچارے بے زبان جوتے۔

راجن ۔ (چڑتے ہوئے) تمہیں شاعری سوجھی ہے اور ہمارے جوتے نہیں مل رہے۔

رام ۔ میں نے کہا نہ۔ کہ وہ بادِ نسیم سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

راجن ۔ (چلاتے ہوئے) تم ضرور بھنگ پی کے آئے ہو آج۔ نہ جانے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ ابھی تو ٹھیک تھے۔

رام ۔ ہائے ری قسمت۔ میرے تخیل کو کوسا جا رہا ہے۔ چچا غالب اب تو ہی میری مدد کر۔ یہ راجن تو پاگل خانے بھجوانے کے لائق ہے۔

(دروازے پر ایک اور دستک)

راجن ۔ آپ بھی تشریف لے آئیے۔ جو کوئی بھی ہے اور پاگل خانے میں شامل

ہو جائیے۔

جوزف۔ (اندر آتے ہوئے) ہیلو مائی ڈیر راجن سرکار تم ابھی تک تیار نہیں ہوا۔ GOOD GOD چھ بجنے کو ہیں۔ اور تمہارا کپڑا نہیں پہنا ہے۔ او رام! تم اس کو تیار نہیں کرا۔

راجن۔ یہ کیا تیار کروائے گا مجھے۔ یہاں تو پہننے کو جوتے ہی نہیں مل رہے۔ رونا تو اسی بات کا ہے۔ ورنہ تم سب سے پہلے تو میں تیار ہو جاتا ہوں۔

جوزف۔ کدھر گیا تمہارا جوتا؟

راجن۔ ارے پھر وہی سوال۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جوتا کہاں ہے؟ تو میں پہن نہ لیتا۔

جوزف۔ او ویری ساری، ویری ساری۔ مگر تم اپنا جوتا آخر کب پہنا تھا؟

راجن۔ آج صبح تو میں دفتر پہن کر گیا تھا۔

جوزف۔ تو تم دفتر میں بھول آیا ہوگا۔

راجن۔ ارے تم بھی عجیب قسم کے انسان ہو۔ تو کیا میں دفتر سے ننگے پاؤں آیا۔

جوزف۔ او ویری ساری۔ ہم بھول گیا۔ رام تم راجن سرکار کا جوتا کا پتہ چلاؤ۔

رام۔ کیا بتاؤں جوزف، ورڈز ورتھ (WORDS WORTH) کی پوئیٹری تو پڑھی ہو گی تم نے۔

جوزف۔ ضرور ضرور۔ ہم بی۔اے میں پڑھا۔

رام ۔ بہت اچھے۔ تو تمہیں یاد ہے کہ وہ اپنی ایک پوئم میں کہتا ہے ۔ کہ
بے جان چیزوں میں جیسے درخت وغیرہ' ان میں بھی روح ہوتی ہے
اسی طرح جوتے بھی زندہ ہوتے ہیں ۔ راجن سرکار کے جوتوں
کے جی میں آیا۔ کہ کہیں گھوم پھر آئیں ۔ کل چاندنی رات تھی۔
کہیں چل دیئے ہوں گے ۔

جوزف ۔ او' وٹ اے گڈ آئیڈیا (OH, WHAT A GOOD IDEA)
کمال کر دیا رام۔

راجن ۔ دیکھو جی' تم دونوں کو مذاق سوجھا ہے اور ہمارے جوتے نہیں
مل رہے ۔ کم بخت میرے ہی جوتوں میں جان ہے اور بادِ نسیم
اور آب و تاب سے نکلا ہوا چاند صرف میرے ہی جوتوں کو بھاتا
ہے ۔

رام ۔ ضرور ضرور ۔ اس لئے کہ تم اپنے جوتے کی پرواہ نہیں کرتے ہوگے
پالش نہیں کرتے ہو گے ۔ آخر وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے ۔

جوزف ۔ بہت اچھے بہت اچھے ۔ رام ٹھیک ٹھاک کرتا ہے ۔ دیکھو
اس لئے ہم اپنا جوتا خود پالش کرتا ہے ۔

راجن ۔ ہے بھگوان' اب تو میرے پاگل ہونے میں کچھ کمی نہیں رہ گئی۔
یہ دونوں مجھے پاگل کئے جا رہے ہیں ۔

رام ۔ بھئی یہ کیا کہہ رہے ہو ۔ ایک بار اور کوشش کرو ۔ داد و فریاد
کرو شاید تمہارے جوتے واپس آجائیں ۔

جوزف۔ بہت اچھے۔
راجن۔ کیا بہت اچھے بہت اچھے لگا رکھا ہے۔ کبھی کوئی عقل کی بات تو کیا کرو۔ تیار ہو جاتے ہیں ہر بات پر داد دینے کے لئے۔ چاہے وہ جہالت کی ہو یا بے وقوفی کی۔
جوزف۔ بہت اچھے بہت اچھے۔ (راجن کو تنگ کرتے ہوئے)
(دروازے پر دستک)
راجن۔ اے موت کے فرشتے۔ اے کال دیوتا۔ کیا میں یقین کر لوں کہ یہ دستک تو نے دی ہے۔
پرکاش۔ (اندر آتے ہوئے) خیر تو ہے راجن بھائی۔ بڑے اطمینان سے موت کے فرشتے کو دعوت دی جا رہی ہے۔
راجن۔ میں اسے ایک عظیم الشان پارٹی دینے والا ہوں۔ اگر تمہاری مرضی ہے تو آ جانا۔ رام اور جوزف تو تیار ہیں۔
پرکاش۔ نہ بھائی باز آیا ایسی دعوت سے۔ آخر بتاؤ تو سہی۔ اتنی عقلمندی کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ تم آج سیر کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے۔ ارے رام تم ہی کچھ بتاؤ۔ آخر یہ تماشا کیا ہے؟
رام۔ قصہ یہ ہے پرکاش بابو۔ ہمارے راجن سرکار کے جوتے کھو گئے ہیں کہیں۔
پرکاش۔ اچھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ کہاں بھول آئے ہیں آپ اپنے جوتے؟

راجن۔ تو تم بھی لال بجھکڑ ہو۔ پہلی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ نہ جانے
آپ سب لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

جوزف۔ بہت اچھا سینٹینس (SENTENCE)

راجن۔ یہ ہیں کال دیوتا کے سگے۔ بات بات پر برچھیاں ملے جا رہے ہیں
پرکاش۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ مل کر جوتا تلاش کریں۔ ہاں
تو راجن بابو آج آپ نے جوتا کس وقت پہنا تھا؟

راجن۔ آج صبح دفتر جاتے وقت۔

پرکاش۔ تو کیا واپسی کے وقت جوتا چھوڑ آئے تھے تم؟

راجن۔ ہاں (چلّاتے ہوئے) تمہاری موٹر میں جو بیٹھ کر آیا ہوں۔ تو جوتے
کی کیا ضرورت تھی مجھے۔

جوزف۔ ہمت رکھو۔ گھبرانا نہیں مانگتا۔

پرکاش۔ ہاں تو ہر روز آپ جوتے کہاں اتارتے ہیں؟

راجن۔ ڈرائینگ روم میں اتار کر پھینک دیتا ہوں۔ اور پھر آشا شو ریک
میں رکھ دیتی ہے۔

پرکاش۔ تو جوتے شو ریک میں نہیں ہیں؟

رام۔ ارے وہاں کہاں ملتے ہیں وہ۔ وہ تو بادِ نسیم۔۔۔

راجن۔ ارے چپ رہ تو۔

پرکاش۔ تو اس کا مطلب ہے کہ جوتے ڈرائینگ روم سے شو ریک
نہیں لے جائے گئے۔ اور وہ یہیں سے چوری ہو گئے۔ ورنہ وہ

یہاں ضرور مل جاتے۔ نہ تو زمین انہیں نگل سکتی ہے اور نہ کہ سیار
انہیں کھا سکتی ہیں۔

راجن۔ تو کیا میرا جوتا چوری ہو گیا ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔
ڈرائینگ روم میں میرے اور آشا کے سوا کوئی آیا ہی نہیں تمہارا
خیال غلط ہے۔ جوتا چوری نہیں ہوا۔ بلکہ یہیں کہیں
ہوگا۔ میرا جوتا چوری نہیں ہو سکتا۔

رام۔ مگر اس مکان کے اندر تو نہیں ہے۔ میں نے اور جوزف
نے ایک ایک کونہ چھان مارا ہے۔

پرکاش۔ آپ اچھی طرح سے یاد کریں۔ ڈرائینگ روم میں آپ کے
آفس سے آنے کے بعد کوئی آیا تو نہیں تھا۔

راجن۔ نہیں بھئی۔ میں سچ کہتا ہوں۔ کوئی نہیں آیا۔

پرکاش۔ سوچو۔ پھر سوچو۔

راجن۔ نہیں نہیں۔ نہیں کوئی نہیں آیا۔

پرکاش۔ تو یقیناً چوری ہو گئے جوتے۔ کہیئے تو میں لکھ کے دیئے
دیتا ہوں۔

راجن۔ اُف میرے جوتے۔ میرے جوتے (اور دھڑام سے زمین پہ
گر پڑتا ہے۔)

جوزف۔ اُف عجیب ہو گیا۔ راجن بے ہوش ہو گیا۔

رام۔ پرکاش! ذرا دوڑ کر پاس والے ڈاکٹر کو بلا لانا۔ جوزف!

پانی کا وہ گلاس تو اُٹھا دو ۔ اس کے مُنہ پر چھڑکوں ۔

جوزف ۔ یہ لو ۔

(رام پانی چھڑکتا ہے ۔ راجن تھوڑا تھوڑا ہوش میں آتا ہے اور
بڑبڑاتا ہے ۔ میرے جوتے ۔ میرے جُوتے ۔)

رام ۔ گھبراؤ نہیں ۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے ۔ ابھی ڈاکٹر آتا ہے ۔
(اتنے میں جھٹ سے دروازہ کُھلتا ہے پرکاش ڈاکٹر
کو لے آتا ہے)

ڈاکٹر ۔ مریض ہوش میں آگیا ہے ۔ ذرا اس کے جُوتے تو اتار دیجیے ۔

راجن ۔ (ایک دم سے اُٹھ پڑتا ہے) کیا کہا ڈاکٹر؟ کس کے
جُوتے؟ جلدی بولو ڈاکٹر ۔

ڈاکٹر ۔ آپ کے اور کس کے؟

دستک

(ایک ریڈیائی ڈرامہ)

ڈرامے کے لوگ :-

ستیش ـــــ ایک نوجوان

نرملا ـــــ ستیش کی بیوی

دلیپ ـــــ ستیش کا دوست

اور

ایک ٹیکسی ڈرائیور

دستک

(دروازے پر دستک)

ستیش۔ کون ہے بھئی؟ (پھر آہستگی کے ساتھ) کم بخت صبح صبح آ ٹپکتے ہیں۔ ذرا بھی نہیں سوچتے۔ کہ اتنی بلا کی سردی میں گرم گرم بستر سے اُٹھ کر دروازہ کھولنا کتنا مشکل ہے۔ اُلّو مُنہ اُٹھا کر چلے آتے ہیں۔

رتنمالا۔ اتنے بگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ بچارا دودھ والا ہوگا۔ چائے پینے کو تو جھٹ لحاف سے سر نکال کر بیٹھ جاتے ہو۔ اب اُٹھو ذرا دودھ والے کے لئے دروازہ تو کھول دو۔

(اتنے میں کوئی دروازہ زور سے کھٹکھٹاتا ہے)

ستیش :- بڑا بدتمیز ہے یہ دودھ والا دروازہ تو اتنی زور سے کھٹکھٹاتا ہے جیسے اس کے اپنے سسر کا گھر ہو جنگلی کہیں کا میرا بس چلے تو ان سب دودھ والوں کو قید کر دوں۔

نرملا :- قید کر دو یا گولی سے اڑا دو۔ مجھ سے تو آج نہیں اٹھا جاتا اور پھر چائے بھی تو تمہیں ہی پینی ہے۔ تمہاری بلا۔ تمہارے سر۔

ستیش :- کوئی بات نہیں۔ آج چائے نہیں نوش فرمائی جائے گی۔ اس وقت بستر سے باہر نکل کر میں نمونیہ سے دوستی نہیں گانٹھنا چاہتا۔ کل ہی کی تو بات ہے تم خود ہی کہہ رہی تھیں کہ مجھے کالے کتے والی کھانسی ہے۔

نرملا :- وہ تو میں یوں ہی کہہ رہی تھی۔

ستیش :- جی ہاں۔ خیر اب زیادہ باتیں نہ بناؤ اور اٹھ کر دروازہ کھولو۔

نرملا :- (جمائی لیتے ہوئے) اوں ہوں۔ یہ تو مجھ سے نہ ہو گا۔

(دستک)

ستیش :- دیکھو میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ کہ اٹھ کر دروازہ کھولو۔ کم بخت جب کوئی کٹھن کام کرنے کی باری آتی ہے تو تم یہ بھول جاتی ہو کہ ہم تمہارے پتی ہیں کیا یہ سب کچھ یاد دلانے کے لئے پھر سے لگن منڈپ میں بیٹھنا ہو گا۔ کیا آگ کے گرد پھر سات چکر کاٹنے ہوں گے۔ اُف میرے بھگوان۔ کیا عجیب قسم کی عورت ہے یہ۔ جب کام کرنے کا وقت آتا ہے تو ہماری مہارانی سوئی رہتی ہیں۔

نرملا :- دیکھو جی۔ تم حد سے بڑھے جا رہے ہو۔ نہ میں نے تمہیں لگن منڈپ میں بیٹھنے کو کہا تھا۔ اور نہ ہی آگ کے گرد چکر کاٹنے کو۔ تم تو خود ہی برات لے کر آئے تھے

مجھے لینے ہے غصہ اپنے گھر والوں کو دکھایا کرو۔ جی ہاں۔
(اتنے میں ایک بار زور سے دروازے پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے اور موٹر کا ہارن
بجتا ہے۔ اور باہر سے آواز آتی ہے ہیلو ستیش)

ستیش۔ (اچھل کر) ارے کم بخت یہ گھسیارہ تو کوئی اپنا لنگوٹیا یار لگتا ہے مگر موٹر تو ہمارے
کسی دوست کے پاس نہیں ہے۔

نرملا۔ ہاں اب تو تم ضرور اٹھو گے۔ لیکن میں اتنا کہے دیتی ہوں اسے پاس نہ ٹھہرانا۔
گھر میں دو روٹیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ کل ہی تو تمہارے لکھنوی نواب
تشریف لے گئے ہیں۔

ستیش۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اپنے ستیش کو تو تم جانتی ہو۔ اگر کوئی مہمان ہے تو ابھی
یوں د۔ ف۔ ع کر کے آتا ہوں۔ آخر اتنا سبق تو تم سے سیکھ ہی لیا ہے ہم نے۔

نرملا۔ پھر وہی جھگڑے کی بات خواب میں کہیں بلیاں تو نہیں دیکھی تھیں رات کو۔

ستیش۔ یو ہو۔ یو ہو۔

نرملا۔ پھر لگ گیا تمہیں یوہو۔ یوہو والا جلاب۔ نہ جانے یہ سب باتیں کس گدھے
سے سیکھ کر آئے ہو۔

ستیش۔ (تنگ کرتے ہوئے) یو ہو۔ یو ہو۔
(اتنے میں دروازہ بہت زور سے کھٹکتا ہے اور ساتھ ہی موٹر کے ہارن کی صدا آتی ہے)

ستیش۔ (زور سے پکارتا ہے) آیا بھائی آیا۔ کیوں اتنی زور سے کھٹ کھٹ کئے
جاتے ہو؟ (دبی زبان سے) جیسے اس کے سسر کا گھر ہو (جھپٹ کے دروازہ کھولتا
ہے) ہاں کہو کیا بات ہے؟

دلیپ ۔ ہیلو ستیش ۔ خوب بھئی ۔ آدھ گھنٹے سے چیخ رہا ہوں ۔ کوئی سنتا ہی نہیں خیر چھوڑو ان باتوں کو ۔ گھر میں تو سب خیریت سے ہیں ۔

ستیش ۔ مگر آپ ہیں کون ۔ میں نے تو آپ کو نہیں پہچانا ۔ شاید ......

دلیپ ۔ ارے تم نے مجھے نہیں پہچانا ۔ میں ہوں دلیپ تمہارا بچپن کا ساتھی بھول گئے مجھے ۔ ہاں بھئی بڑی مدت کے بعد جو ملے ہیں ہم ۔ ڈرائیور ۔ ڈرائیور (پکارتا ہے)

ڈرائیور ۔ حضور !

دلیپ ۔ سامان اندر رکھ دو ۔

ڈرائیور ۔ بہتر (یہ کہہ کر سامان اندر رکھنے لگ جاتا ہے چیزوں کے اٹھانے گرانے کی آواز)

دلیپ ۔ بھئی ستیش ! بڑی سردی ہے تمہارے شہر میں ۔ چلو اندر بیٹھیں (چلنے کی آواز) اوہو ۔ تو یہ تمہارا ڈرائینگ روم ہے ۔ کتنا سندر صوفہ ہے ۔ سچ بتاؤ جہیز میں ملا ہو گا ۔ ارے ہاں ۔ تم نے بھابی سے ملاقات تو کرائی ہی نہیں کہاں ہیں وہ ؟

ستیش ۔ وہ ذرا سوئی ہوئی ہیں طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی ۔

دلیپ ۔ چلو خیر کوئی بات نہیں ۔ ہاں ذرا گرم گرم چائے پلوا دو ۔ مرا جا رہا ہوں سردی میں ۔ چائے کے ساتھ ٹوسٹ تو تم کھلوا دو گے ہی ۔ پر ذرا دیکھنا انڈے بھی ساتھ ضرور ہوں اور تھوڑا سا شہد بھی ۔

ستیش ۔ ہاں بھئی چائے تو ضرور پلوا دیں گے مگر ٹوسٹ انڈے کے لئے تمہاری بھابی سے درخواست کرنی پڑے گی وہ ہیں ہمارے گھر کی کنٹرولر آف راشننگ ڈیپارٹمنٹ ۔

(دستک)

ستیش ۔ کون ہے ؟ ڈرائیور ۔ جی میں ہوں ٹیکسی کا ڈرائیور ۔ کرایہ تو دیجیے ۔

دلیپ ۔ او ہو ۔ باتوں باتوں میں کرایہ دینا بھول ہی گئے ۔ دراصل میرے پاس سو کا

نوٹ ہے۔ تم ہی دے دو ستیش۔ بعد میں ہم سے لے لینا۔

ستیش۔ میرے پاس تو ہزار کا ہے چھوٹا ہوتا تو ضرور دے دیتا۔

ڈرائیور۔ (بلند آواز سے) اجی صاحب جلدی کیجیے۔ مجھے اور کام بھی کرنے ہیں

دلیپ۔ سو روپے کا نوٹ ہے میرے پاس۔ پھر لے جانا۔

ڈرائیور۔ یہ بھی خوب رہی۔ ڈیڑھ روپیہ وصول کرنے کے لیے میں تین روپے کا پٹرول خرچ کر کے آؤں۔ نا صاحب' یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ مہربانی کر کے مجھے جیسے بھی ہو کرایہ ابھی ہی دلوا دیجیے۔

دلیپ۔ (دبی زبان میں) میرے بھگوان! اب کیا ہو گا۔ یہ کم بخت جان چھوڑتا نظر نہیں آتا۔ ارے بھائی ستیش۔ اب تو تم ہی ہماری لاج بچا لو ورنہ بنی بنائی عزّت سب خاک میں مل جائے گی۔ یہ ڈرائیور لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں

ستیش۔ دیکھتا ہوں شاید تمہاری بھابی کے پاس کچھ پیسے رکھے ہوں۔

(دوسرے کمرے میں جاتا ہے۔ چلنے کی آواز)

نرملا۔ (دبی آواز میں) سن لیا ہے میں نے سب کچھ۔ تم تو بس میرے سامنے ہی اینٹھ سکتے ہو۔ اسے کہا تک بھی نہیں۔ کہ ہمارے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں دو روپیوں سے کیا ہو گا؟ کہاں سے دو گے ٹیکسی کا کرایہ؟

ستیش۔ میں کیا کرتا نرملا۔ اس نے تو مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

نرملا۔ ایسے آدمی بولنے کا موقع کب دیتے ہیں۔ میرے سامنے تو بڑی ڈینگیں مارتے تھے۔ (چڑاتے ہوئے) تم اپنے ستیش کو تو جانتی ہو۔ ابھی دفع کر کے آتا ہوں۔

ستیش۔ بس بس زیادہ باتیں بند کرو۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔ اچھا اب یہ تو

بتاؤ کہ ٹیکسی والی مصیبت کیسے ٹلے؟

نرملا۔ میں اپنے میکے سے پیسے تھوڑے ہی لا کے دے سکتی ہوں۔ یہ لو دو روپے ہیں یا ٹیکسی کا کرایہ دو یا اُسے انڈے کھلاؤ۔

ستیش۔ اچھا۔ اچھا لاؤ ٹیکسی والے کو تو دفع کروں۔ بعد میں دیکھنا اُسے انڈے کھلواتا ہوں یا۔ یا۔!

نرملا۔ دیکھ لیں گے یہ بھی۔

ستیش۔ ہاں ہاں دیکھ لینا۔ لو ہو (چلنے کی آواز)

ستیش۔ ڈرائیور!

ڈرائیور۔ جی حضور!

ستیش۔ یہ لو اپنے پیسے آٹھ آنے واپس کر دو۔ سمجھے!

ڈرائیور۔ یہ لیجئے صاحب۔ جے ہند۔

ستیش۔ ابے مجھے کیا کہتا ہے۔ جے ہند دانت پیس کر اُسے کہہ جو سوتا ہے جیسے گھوڑے بیچ کے آیا ہو۔ اُلو کہیں کا۔

دلیپ۔ (جمائی لیتے ہوئے) کیا کہا ستیش بھیا؟

ستیش۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا وہ ٹیکسی والا بڑا اُلو ہے۔

دلیپ۔ ہاں میں نے تو پہلے ہی کہا تھا یہ ڈرائیور لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اچھا اب چائے کب پلواتے ہو دوست سالے بھوک کے دم نکلا جا رہا ہے۔

ستیش۔ ہاں ہاں بھئی گھبراؤ نہیں۔ ابھی تو ضیافتوں کا سلسلہ ہم نے شروع

ہی نہیں کیا۔ مدت بعد آئے ہو۔ چائے پیئے بغیر کب جانے دیتا ہوں آپ کو۔
گارڈ ہاں تو یہاں سب دوپہر کو ہی چلتی ہیں۔
دلیپ۔ مجھے تو کل جانا ہے ستیش بابو۔
ستیش۔ ہاں ہاں میں کب کہتا ہوں کہ ابھی جاؤ۔ میں چائے لے آتا ہوں
(اندر جاتا ہے۔ چلنے کی آواز)
ستیش۔ یہ کم بخت تو کل تک بھی پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اب تم ہی کوئی
تدبیر بتاؤ۔ ہم تو ہار گئے۔
نرملا۔ (چٹکی بجاتے ہوئے) سوچ رکھا ہے میں نے۔ میں چائے لاتی ہوں
تم جلدی سے کپڑے بدل ڈالو۔ اور سورج کی داڑھی مونچھ لگا لو۔
جو وہ اپنے سکول کے ڈرامے کے لیے لایا تھا تم میرے باپ بن جاؤ۔
ستیش۔ اس سے کیا ہوگا۔ تم بھی عجب قسم کی عورت ہو پتی سے باپ بنا رہی ہو
آخر کرنا کیا ہے مجھے۔
نرملا۔ بس تم میرے پتا بن کر چائے لے جاؤ۔ کہنا ستیش ذرا کام سے باہر گیا
ہے اور کہنا تمہیں تپ دق ہے۔ کھانسنا۔ اسے ڈرانا تب دیکھنا
کیسے بھاگتا ہے وہ۔ ہاں اور کہنا کہ اس گھر میں بھوت پریت
رہتے ہیں۔ میں روشن دان سے پتھر پھینکوں گی۔ تم کہنا کہ بھوت
نے پھینکے ہیں۔
ستیش۔ واہ بھئی خوب یہ بھی ایک ہی رہی۔ چائے میں کتنی دیر ہے؟
نرملا۔ کچھ نہیں ہیٹر پہ پانی رکھ آئی تھی ابل گیا ہوگا۔ ابھی لاتی ہوں تم

تیار ہو جاؤ۔ وہ رکھے ہیں پرانے کپڑے، داڑھی اور مونچھیں۔ اچھا اب میں جا کر چائے لاتی ہوں۔

ستیش۔ (اپنے آپ سے) ہے بھگوان پتی سے باپ بنا دیا۔ اب کہیں کچھ اور نہ بنا دینا ہمیں۔ اور اب یہ داڑھی لگانی پڑھی ہے خیر مصیبت ٹالنے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے (داڑھی لگاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گنگناتا ہے۔ کپڑے بدلنے کی آواز) اُف کتنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑے ہیں)

نرملا۔ (اندر داخل ہوتے ہوئے) خوب۔ خوب۔ تم تو بالکل پہچانے ہی نہیں جاتے۔ یہ لو چائے بھی لے آئی ہوں۔ اب اپنا کام خوبی سے انجام دینا۔ ورنہ یاد رکھو رات کو کھانا بند کر دوں گی تمہارا۔

ستیش۔ ہاں ہاں۔ جو جی میں آئے کرنا۔ لاؤ ٹرے اِدھر لاؤ اور ہماری کامیابی کے لیے دعا کرو۔ لاؤ۔

(ٹرے لیتا ہے اور دوسرے کمرے میں جانے کی آواز)

ستیش۔ (بڈھوں کی طرح بدلی ہوئی آواز میں اور کھانستے ہوئے) دلیپ آپ کا نام ہے؟

دلیپ۔ ہاں بابا میرا ہی نام دلیپ ہے۔

بڈھا ستیش۔ (ہنستے ہوئے) میں تمہارے لیے چائے لایا ہوں بیٹا۔ تمہارا دوست یعنی میرا داماد ذرا کام سے باہر چلا گیا ہے۔ میں نے سوچا چلو میں ہی چائے دیتا آؤں آپ کو۔

دلیپ۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ لائیے ٹرے مجھے دے دیجئے۔
بڈھا سیٹھ۔ ہاں بیٹا یہ لے لو (دلیپ ٹرے لے لیتا ہے اور میز پر رکھ چھوڑتا ہے۔ برتنوں کی صدا) ہاں بیٹا۔ اب تو اتنی سکت ہی نہیں رہی کہ چائے کے برتن اٹھا لے جاؤں۔ کم بخت دم پھول جاتا ہے
دلیپ۔ کیوں کیا وجہ ہے؟
بڈھا سیٹھ۔ کیا پوچھتے ہو دلیپ بابو پچیس سال ہو گئے ہیں (کھانستا ہے) کم بخت بخار ہی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کوئی کہتا ہے سل ہے۔ کوئی کہتا ہے گردوں کے درد کی وجہ سے بخار آتا ہے۔
دلیپ۔ آپ کو پچیس سال سے بخار آتا ہے؟ تو یقیناً سل ہو گا! آپ کسی پہاڑ پر کیوں نہیں جاتے۔
بڈھا سیٹھ۔ کیا جاؤں پہاڑ پر بیٹا! (کھانستا ہے) اب تو وقت قریب آ رہا ہے۔ یہ سیٹھ اور نرملا تو مجھے جانے ہی نہیں دیتے۔ میری وجہ سے تو اب نرملا بیچاری کو بھی تھوڑا تھوڑا بخار آنے لگا ہے اتنے ضدی ہیں کہ مجھے اپنے لئے علیحدہ برتن ہی نہیں رکھنے دیتے۔
دلیپ۔ (اٹکتے ہوئے) تو۔ تو۔ آپ انہیں برتنوں میں کھاتے پیتے ہیں؟
بڈھا سیٹھ۔ ہاں بیٹا کیا کروں مجبوری ہے۔ میں تو مدت سے انہیں کہتا آیا ہوں۔ کہ وہ ایسا نہ کیا کریں (کھانستا ہے) خیر بیٹا تمہیں ان باتوں سے کیا۔ چائے پی لو۔
دلیپ۔ پیتا ہوں۔ مگر یہ تو بتائیے۔ آپ رہتے کونسے کمرے میں ہیں؟

بڈھا سیتیش۔ اسی صوفے پر پڑا رہتا ہوں۔ دو تو کمرے ہیں سارے۔ اس کمرے کا دروازہ ذرا سٹرک کی طرف کھلتا ہے ذرا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آتی ہے تو دل بہل جاتا ہے ورنہ اس مکان کا ماحول تو اتنا خراب ہے کہ ایک دن بھی آرام سے نہیں گذرتا۔ صبح اٹھو تو سارا گھر پتھروں سے اٹا پڑا رہتا ہے۔ ورنہ برتن ٹوٹ جاتے ہیں۔ صوفے خود بخود الٹ جاتے ہیں۔ رات کو تھوڑی سو یا سویا جاگ اٹھتا ہے۔ کل ہی کی تو بات ہے سیتیش کی چارپائی خود بخود الٹ گئی (دکھاتا ہے) اور رات کو کبھی کبھی میری ٹانگیں بھی خود بخود چارپائی کے ساتھ بندھ جاتی ہیں۔ لیکن جانی نقصان کسی کا بھی نہیں ہوا۔ اب تو وہ ہم سے گھل مل گیا ہے۔ ہاں البتہ اجنبی اسے اچھے نہیں لگتے۔

دلیپ۔ کسے اچھے نہیں لگتے۔ کون ہے جو ایسا کرتا ہے (گھبراتے ہوئے)۔

بڈھا سیتیش۔ ابھی وہ نظر آجائے تو مرمت نہ کر دوں اس کی۔ رونا تو اسی بات کا ہے ظاہر تو ہوتا ہی نہیں۔ روح جو ہوئی۔ لیکن جب یاد کرو کم بخت آجاتا ہے۔

(اتنے میں زور سے ایک پتھر گرتا ہے اور چائے کے برتنوں کے گرنے کی آواز آتی ہے)

بڈھا۔ بھوت بھوت۔ رام رام۔ رام رام۔

دلیپ۔ (اٹھتے ہوئے اور چلاتے ہوئے) ارے بچاؤ۔ کوئی بچاؤ۔ ہم مر گئے — بھوت بھوت۔ بھوت۔

بڈھا سیتیش۔ رام رام۔ بیٹا شور نہ کرو۔ ورنہ بھوت ناراض ہو جائے گا۔ اور جب وہ ناراض ہو جاتا ہے تو پھر تو بھگوان ہی بچائے۔ رام رام کہو۔

دلیپ۔ رام۔ رام (ڈرتے ہوئے)

بڈھا سیٹھ۔ ہاں ہاں کہو رام رام۔ کم از کم دس دفعہ تو کہو۔

دلیپ۔ رام۔ ایک۔ رام۔ دو۔ رام۔ تین۔ رام چار۔ رام پانچ۔ رام چھ۔ رام سات۔ رام آٹھ رام نو۔ رام دس (ڈر کے مارے چلا کر کہتا ہے)

بڈھا سیٹھ۔ نہیں۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں (کھانستا ہے) اب اس کی مجال نہیں کہ وہ ہمارے نزدیک آئے۔ بھگوان رام سے بہت گھبراتا ہے وہ۔

دلیپ۔ اُف میری تو جان نکلنے والی تھی۔ (گھبراتے ہوئے) اب۔ اب تو نہیں آئے گا۔ مگر کہیں وہ سب کہتا ہے یوں۔

بڈھا سیٹھ۔ (بھیانک ہنسی ہنس کر) تم اُس کی کہانی جاننا چاہتے ہو تو سنو آج سے بیس برس پہلے وہ اسی مکان میں رہتا تھا۔ ہاں اسی مکان میں۔ اسی کمرے میں۔

دلیپ۔ (گھبراتے ہوئے) اسی کمرے میں؟

بڈھا سیٹھ۔ ہاں ہاں۔ اسی کمرے میں۔ وہ ایک بڑا امیر آدمی تھا کہتے ہیں اُس کے پاس اتنا خزانہ تھا۔ کہ برسوں تک اگر اس کے پوتے بھی کھاتے تو بھی ختم نہ ہوتا۔

دلیپ۔ تو پھر؟

بڈھا سیٹھ۔ ایک رات وہ یہیں سو رہا تھا۔ بس اسی جگہ پہ جہاں تم بیٹھے ہو۔ ڈاکوؤں نے اُسے قتل کر دیا اور اس کا خزانہ لوٹ کر لے گئے اور اُس کے بعد آج تک اُس کی روح یہاں بھٹکتی رہتی ہے۔ کوئی بھی اس

مکان میں رہنے کے لئے تیار نہیں تھا ہمیں بھی بہت کہا گیا لیکن ستیش
مانا ہی نہیں۔ لیکن کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ تم جانتے ہو مکانوں کی تنگی
ہے۔ ارے باپ رے۔ تم نے مجھے پھر اس کی یاد دلا دی۔ کہیں وہ
پھر نہ آجائے۔

دلیپ۔ نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔ نہیں۔ میں مر جاؤں گا۔
(اتنے میں ایک اور پتھر گرتا ہے)

بڈھا ستیش۔ بھوت بھوت۔ بھوت۔ رام۔ رام رام۔

دلیپ۔ (چلاتا ہے) بھوت بھوت۔ رام رام۔ رام۔

بڈھا ستیش۔ ہائے رام۔ اس بھوت نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ اجنبی تو اسے
ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ بس دیکھتے ہی پتھر مارنے لگ جاتا ہے۔ ابھی
کل ہی کی تو بات ہے۔ کم بخت نے نرملا کی چھوٹی بہن کو اتنے پتھر مارے
کہ بچارای کے سر سے خون بہنے لگا۔ اور وہ یہاں سے بھاگ گئی بچاری
چند گھنٹے رہی ہو گی یہاں۔ اسے چائے تک بھی نہیں پینے دی۔

دلیپ۔ سچ! تو۔ تو میں بھی یہاں نہیں رہونگا۔ میں ابھی جاتا ہوں کسی
ہوٹل میں رہوں گا چل کر۔ یہاں تو میرا دم نکل جائے گا ورنہ۔

بڈھا ستیش۔ ایسا کیوں کرتے ہو ستیش بچارا کیا کہے گا؟ اس کے آنے تک تو انتظار
کرو۔ بچارا ناراض ہو جائے گا ورنہ۔

دلیپ۔ نہ۔ نہ بھائی۔ میں جاتا ہوں۔ میں ایسے مکان میں ایک پل بھر کے لئے
بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ میں جاتا ہوں۔ شکر ہے میں اپنے ساتھ ایک ہی سوٹ کیس

لایا تھا۔ میں خود ہی اٹھا کے لے جاتا ہوں ستیش سے میرا پرنام کہہ دیجئے گا
اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔

بڈھا ستیش۔ اچھا جیتے رہو بیٹا۔ ستیش ناراض تو ضرور ہوگا۔ جیتے رہو۔

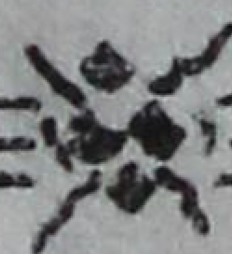
(دلیپ سوٹ کیس اٹھا کر چلا جاتا ہے۔ دروازہ بند کرنے کی آواز)

ستیش۔ (زور زور سے ہنستا ہے) اب آ بھی جاؤ نرملا۔ آخر بھگا دیا نہ ہم نے!

نرملا۔ (اندر سے آتے ہوئے) ہاں بھئی مان گئے آج تمہیں۔ وہ بھی الّو ہی نکلا۔
کبھی دن کو بھی بھوت دکھائی دیتے ہیں۔ اچھا اب یہ داڑھی تو اتار دو۔

ستیش۔ ہو ہو۔ ہو ہو (دونوں زور زور سے ہنستے ہیں۔ اتنے میں دروازے پر
دستک ہوتی ہے) کون ہے بھئی۔ آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔

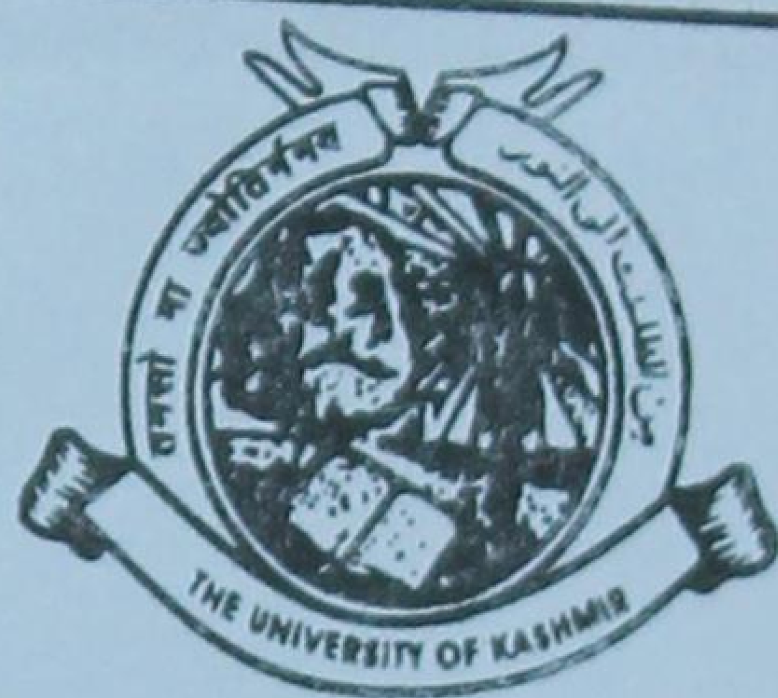
دلیپ۔ (زور زور سے کھولتے ہوئے) جی میں ہوں دلیپ۔ میں نے
سوچا۔ رات یہاں ہی گزار لوں۔ کہاں ہوٹلوں میں بھٹکتا پھروں گا۔




ALLAMA IQBAL LIBRARY

23824

23824
19-12-58



ALLAMA
IQBAL LIBRARY

UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN